دسمبر ۱۹۶۳ء

RAZA LIB...
RAMPUR, U.P.

مدیر اعلیٰ:- نیاز فتحپوری

# نگار پاکستان

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲

ٹیلیفون نمبر ۷۴۶۹۳

دسمبر ۱۹۶۳ء

# نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ

نیاز فتح پوری

نائب مدیران

فرمان فتحپوری     عارف نیازی

زر سالانہ     قیمت فی پرچہ

دس روپے     پچھتر پیسے

نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی۔ بموجب سرکلر نمبر ڈی/ایف یو پی ـــ بی ۳۶۶۹ ـ ۶۸ محکمہ تعلیم کراچی

پرنٹر، پبلشر: ایم عارف نیازی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ سے شائع کیا۔ کتابت: عالم علی خاں

ماہنامہ نگار پاکستان

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگیا

# فہرست

۴۲ واں سال | فہرست مضامین دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء | شمارہ ۱۲


ملاحظات ........ نیاز فتحپوری ........ ۴

ہماری ادبیات مستقبل میں ........ فراق گورکھپوری ........ ۹

چند تاریخی و ادبی لطائف ........ نیاز فتحپوری ........ ۱۷

سیفو ........ برہم ناتھ دت ........ ۲۰

حافظ کا معشوق ........ پروفیسر سید حسن ........ ۲۷

شیطان سے ملاقات ........ ت - ا - ن ........ ۳۹

مسلم بادشاہوں کی رواداریاں ........ ڈاکٹر سید محمود ........ ۴۶

عطرِ فتنہ ........ عقیل احمد جعفری ........ ۴۹

گردش زمین آپ دیکھ سکتے ہیں ........ نیاز فتحپوری ........ ۵۵

تخلیق آدم ........ سرفراز نیازی ........ ۵۷

باب المراسلہ والمناظرہ ........ ۱ - بعض آیات قرآنی / ۲ - کچھ ایلیا کے بارے میں ........ نیاز فتحپوری ........ ۶۰

باب الاستفسار ........ جبر و اختیار ........ نیاز فتحپوری ........ ۶۶

منظومات ........ دل شاہجہانپوری مرحوم - شفقت کاظمی / اکرم دھولوی - سید حرمت الاکرم - ضیا رشبنی ........ ۷۱

بیاضِ نیاز ........ ۷۵

مطبوعات موصولہ ........ ادارہ ........ ۷۶

# نگارِ پاکستان سنہ ۶۴ء کا سالنامہ

# تذکروں کا تذکرہ

## (نمبر ہوگا)

اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کرے گا کہ :-

(۱) تذکرہ نگاری کا فن کیا ہے ؟

(۲) اس کی امتیازی روایات و خصوصیات کیا رہی ہیں ؟

(۳) تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا ؟

(۴) اُردو فارسی میں آج تک کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ؟

(۵) ان تذکروں اور ان کے مصنّفین کی کیا نوعیت ہے ؟

(۶) ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے ؟

(۷) ان سے کسی خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے ؟

(۸) ان تذکروں میں اردو فارسی زبان و ادب کا کتنا بیش خزانہ محفوظ ہے ؟

(۹) یہ خزانہ ادب کے تاریخی، تحقیقی، سوانحی اور تنقیدی شعبوں کے لئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ہے ؟

ضخامت ـــــــ تقریباً ۲۵۰ صفحات

قیمت ـــــــ چار روپے

# ملاحظات

## ( ادارۂ فکر و نظر سے خطاب )

### نیاز فتحپوری

کل دوپہر کو فرمان صاحب نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ کیا آرٹس کونسل میں مجھے کوئی تقریر کرنا ہے۔ میں نے پوچھا یہ خبر بد آپ نے کہاں سنی، تو انھوں نے "مارننگ نیوز" کا حوالہ دیا۔ میں نے کہا یہ خبر بالکل غلط ہے۔ لیکن چونکہ میں نے اس کے ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا تھا۔ اس لئے وہ واقعی سچ ہو کر رہ گئی اور شام کو عالیہ' نوید کا ایک مطبوعہ کارڈ میرے پاس لے کر آئیں جس میں درج تھا کہ "آج یعنی ۲۳ نومبر کو شاعر انقلاب جوش صاحب کی صدارت میں نیاز فتحپوری اپنی زندگی اور فن پر روشنی ڈالیں گے" چونکہ ڈاکٹر عالیہ امام کے نام کے ساتھ "معتمد ادارۂ فکر و نظر" بھی درج تھا۔ اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس تقریب کا ذمہ دار یہی ادارہ بلکہ خود ڈاکٹر عالیہ کی ذات ہے، کیونکہ دنیا میں اس طرح کے (STUNTS) یا فجائی حوادث ہمیشہ عورت ہی کی طرف سے ظہور میں آتے ہیں اور اپنے عورت ہونے کی حیثیت سے اسے اعتماد ہوتا ہے کہ گیارہویں گھنٹے کیا اگر بارہواں گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی وہ یہ دعوے کر بیٹھے کہ آفتاب اب طلوع ہوا ہے تو لوگوں کو اس کے صحیح باور کر لینے کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار نہ ہوگا۔ وقت مرد پر گزرتا ہے عورت پر نہیں وہ خود وقت سے گزرتی ہے اور اسے کبھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے کبھی اس سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ مجھے اس جلسہ کی انعقاد کا علم کل شام کو ہوا اور اگر اس سے قبل وہ عالیہ کے ذہن میں تھا تو انھوں نے مجھے بے خبر رکھا۔ غالباً اس لئے کہ معاملہ محض حسن و حسن ظن کا تھا مجھ یا کسی اور کو آزمانے کا نہ تھا۔

بہرحال اس تمہید سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جس تقریب کے سلسلے میں انھوں نے آپ لوگوں کو تکلیف دی ہے اس کا تعلق صرف ڈاکٹر عالیہ کی ذات سے ہے۔ کیونکہ وہ اس ادارے کی خلاق ہیں یا پھر حضرت جوش سے کہ اگر آپ، ہیں یا عالیہ کوئی بھی نہ ہو تو وہ اپنی ذات سے ایک مستقل انجمن ہیں۔

اس کارڈ کا یہ فقرہ کہ میں اپنے فن اور اپنی زندگی پر روشنی ڈالوں گا اسے تو آپ بالکل نظر انداز کر دیجئے کیوں کہ اول تو ادارۂ فکر و نظر کی کسی تقریب میں اس کا کوئی موقع نہیں کہ میں اپنی زندگی پر روشنی ڈالوں جو یکسر قاطع فکر و نظر ہے اور اگر ہو تو یہ کیا ضرور ہے کہ میں اس کا اظہار کروں۔ کوئی ایک چیز تو میری ملکیت میں رہنے دیجئے۔ اقرار نہیں تو انکار ہی سہی۔ اب رہا میرا فن سو اول تو یہ ایک ایسا لفظ ہے جس سے مجھ سا بے فن آدمی کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا۔ اور اگر ہو تو بھی یہ کیا ضرور ہے کہ ایک "رند ہزار شیوہ" اپنی رسوائیوں کا اعتراف بھی کرے یا اگر وہ معذرت کرے تو اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔

" لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست "

بہر حال اس وقت نہ میری زندگی میرے سامنے ہے اور نہ میرا فن - میری زندگی، زندگی کیا۔ اتہام زندگی سمجھیے ہمیشہ اسی شکوہ و شکایت میں گزر گئی کہ " بچہ کار کشت مارا " لیکن دہقان ازل سے تو بینک مجھے اس کا معقول جواب ملا لیکن جو اس کے شکمی کاشتکار یا مستاجر ہیں انھوں نے تو خیر قسم ہی کھائی ہے کہ وہ کوئی بات خدا لگتی نہ کہیں گے۔

بہر حال وہ میری زندگی ہو یا میرا فن - ہیں دونوں ایک ہی چیز اور دونوں غارت و برباد۔ سعدی کا شعر ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بہ میرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

باور کیجئے میں بھی اسی مرض کا مریض ہوں اور یہ آپ جانتے ہیں کہ یہ مرض جاتا نہیں ــ میں دیکھتا ہوں کہ یہ بات کچھ تصوف کی طرف چلی گئی اور میرا یہ کہنا غالباً بالکل ویسا ہی ہے جیسے خسرو نے کہا ہے ؎

غمزۂ تو بر دل سلطاں زند
ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

لیکن کیا کروں میرے دل کو اگر تسکین ہوتی ہے تو ایسی ہی سمجھ میں نہ آنے والی باتوں سے - مسلمانوں کی غالب جماعت مجھے کافر ملحد سمجھتی ہے۔ مرتد و بے دین خیال کرتی ہے اور اس کا بہترین جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ ؎

گفتہ بودی ہمہ زرقند و فریب رند و فسوس
سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

یعنی میں ایسا تو نہیں ہوں لیکن اگر آپ ایسا فرماتے ہیں تو خیر میں ایسا ہی ہوں گا - یہ تو ہوئی صلح و آشتی کی بات لیکن اگر میں معارضانہ گفتگو میں آجاؤں تو بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ معلوم نہیں غلط یا صحیح - لیکن میں یہی سمجھتا ہوں کہ خدا نے دو قسم کے آدمی پیدا کئے ہیں ایک احمق اور دوسرے ذی عقل اور ان کی پہچان کے لئے اس نے مذہب پیدا کر دیا۔ تاکہ ان دونوں جماعتوں کی پہچان ہو سکے - اسی حقیقت کو زردشت نے اہرمن و یزداں سے تعبیر کیا اور اسلام نے روایت و درایت سے - پھر اس کو میری بد قسمتی کہئے یا خوش قسمتی کہ میری تعلیم کا آغاز ہی اس ماحول میں ہوا جو اہرمن روایت کا متبع تھا اور میرا یزداں کبھی اس سے متفق نہ ہو سکا - وہ یہ کہتے تھے کہ اصل چیز روایت ہے۔ یہانتک کہ راویین کی جس کتاب کے جھاڑنے سے سب سے زیادہ خاک اڑے وہی سب سے زیادہ قابل قبول ہے اور اس کے خلاف درایت سے کام لینے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ گویا عقل کا وہ ذخیرہ جو خدا نے ازل میں پیدا کیا تھا وہ زیادہ سے زیادہ آٹھویں دسویں ہجری تک بٹ بٹا کر ختم ہو گیا اور اب کسی کو مدعی عقل ہونے کا حق حاصل نہیں ہے - اگر ان کا یہ خیال صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کہ درایت صرف ڈھکوسلا تھا اور خدا نے جنت صرف انھیں کے لئے پیدا کی ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اہل الجنت بلہٗ " بلہٗ کے معنی احمق و بیوقوف کے ہیں - یعنی اس شخص کے جو زیادہ مین میکھ نہیں نکالتا اور روایات پر آمنا و صدقنا کہہ دیتا ہے خواہ وہ درایتاً کتنی ہی لغو کیوں نہ ہو - ہاں تو کہنا یہ تھا کہ میں پیدا تو ہوا اسی ماحول میں جو کٹر روایت ہی روایت تھا - لیکن میری فطرت تھی یکسر درایت پسند - اس لئے میں اپنے اساتذہ کے لئے عذاب جان بن کر رہ گیا - وقت تو ضائع ہوگا لیکن روایت کے چند لطائف ضرور سن لیجئے :-

- جب عقاب (چیل) ضعیف و سالخوردہ ہو جاتی ہے اور بینائی کھو بیٹھتی ہے تو وہ فضا میں اتنی بلندی تک

پرواز کرجاتی ہے کہ تمازت آفتاب سے اس کے پَر جل جاتے ہیں (ہوسکتا ہے کہ شعراء نے "فروغ تجلی بسوزد پرم" کا خیال اسی روایت سے مستعار لیا ہو) اور جب اس کے پر جل کر خاک سیاہ ہوجاتے ہیں تو وہ ایک شور و تلخ کنویں میں غوطہ لگاکر از سرِ نو جوان ہوجاتی ہے"۔

یہ نہ طلسم ہوشربا کا کوئی ٹکڑا ہے، نہ چانڈو خانے کی گپ بلکہ بیان ہے علامہ قزوینی کا۔ کون قزوینی؟ جو ابن عربی کے رفقاء میں سے تھے اور جو خلیفہ المستعصم باللہ کے عہد میں واسط اور حلّہ کے قاضی تھے۔ ایسی ہی ایک تحقیق اور ملاحظہ ہو۔

۱؎ "جب چیل ضعیف و کمزور ہوجاتی ہے تو اس کے بچے اپنی پیٹھ پر لاد کر ہندوستان کے ایک چشمہ تک لے جاتے ہیں اس میں غوطہ لگاتے ہیں اور چیل پھر جوان ہوجاتی ہے۔

۲؎ "گدھ چیل کے انڈے سے پیدا ہوتا ہے اور چیل گدھ کے انڈے سے۔ تمام چیلیں مادہ ہوتی ہیں۔ وہ دوسری چڑیوں کے نر سے مل کر انڈے دیتی ہیں۔ لیکن صرف تین۔ دو انڈے وہ خود سیتی ہیں۔ تیسرا انڈا پھینک دیتی ہیں جسے ایک اور طائر "کاسر العظام" (ہڈی توڑ) اٹھا لاتا ہے اور اس سے بچہ نکالتا ہے ......

چیل ہندوستان سے ایک پتھر اپنے گھونسلہ میں لاکر رکھ دیتی ہے تاکہ انڈا دینے میں آسانی ہو۔ یہ پتھر کھوکھلا ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک اور پتھر ہوتا ہے۔ (جسے سنگ پارس بھی کہتے ہیں)

یہ بھی نہ کسی دیوانہ کی بڑ ہے۔ نہ خواب پریشاں بلکہ تحقیق ہے علامہ دمیری کی۔ کون دمیری؟ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مفسر، محدث، فقیہ اور جامع ازہر قاہرہ میں ادب و فلسفہ کے استاد! "کار طفلاں تمام کرنے والے پروفیسر"!

یہ ہیں کارنامے ہمارے علماء سلف کے جن میں صرف دو کا میں نے ذکر کیا ہے، ورنہ یوں تو وہ بیشمار ہیں۔ خیر یہ باتیں تو صرف طبیعیات حیوانی سے متعلق ہیں۔ جن کے انکار سے ایک شخص کافر نہیں ہوتا اور ممکن ہے ہمارے علماء عہد حاضر بھی اس کو صحیح نہ سمجھیں۔ لیکن جب اس سے آگے سوال، کرامات، خرق عادات و معجزات کا آتا ہے تو پھر سرحد "بسوزد پرم" کی شروع ہوجاتی ہے۔ اور یہیں سے دو راستے پیدا ہوجاتے ہیں، ایک بقول کسی شاعر کے مکہ کا اور دوسرا ترکستان کا! یعنی جس وقت یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ فلاں بزرگ نے کنویں میں گرجانے والی بھینس کو صرف ہاتھ کے اشارے سے دفعتاً باہر نکال لیا۔ یا یہ کہ ایک ولی اللہ کوئی غرق شدہ بارات پوری کی پوری دریا سے زندہ باہر نکال لائے یا یہ کہ کسی بزرگ کا جسم، کثرت ریاضت سے اتنا لطیف ہوگیا تھا کہ ٹپکا ان کی کمر سے آر پار ہوجاتا تھا "لیعنی ہے کیا جو کس کے باندھیے" تو پھر انکار ذرا مشکل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہ بیان تذکرۃ الاولیاء۔ "سیر الانبیاء" "کرامات غوثیہ" کا ہے اور ان کی تکذیب ذرا خطرناک بات ہے۔ اس کے بعد تیسری منزل "مذہبی مابعد الطبیعیات کی آتی ہے۔ اور یہ اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ پھر کسی کو یقین آئے یا نہ آئے۔ لیکن چونکہ بیان مفسر "بحر الدرر" کا ہے اس لئے ماننا ہی پڑتا ہے کہ حضرت اسرافیل کا سر اگر ایک طرف آسمان کو چھوتا ہے تو دوسری طرف پاؤں زمین کے اندر تحت الثریٰ پر قائم ہیں اور حسب تحقیق حدائق الحقائق اس کو بھی حقیقت ہی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر جناب اسرافیل کے سر پر تمام دریاؤں اور سمندروں کا پانی انڈیل دیا جائے تو ایک قطرہ زمین پر نہ گرے۔ اسی طرح حسب بیان "شفاء النصائح" یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ بعض فرشتوں کی جسامت اتنی بڑی ہے کہ اگر ان کے ایک بازو سے دوسرے بازو تک پہنچنا چاہیں تو یہ مسافت تین سو سال سے کم میں طے نہیں ہوسکتی اور کندھے سے کان تک کا فاصلہ ۵۰۰ سال

کا اور ایک شانے سے دوسرے شانے تک کا فاصلہ ۵۰۰ سال کا ہے۔ اس سے آگے قصص قرآنی کی منزل پر جب آئیں گے تو وہاں بھی آپ کو انھیں عجائب سے گزرنا پڑے گا۔ یہ تو آپ نے قرآن مجید میں پڑھا ہی ہوگا کہ جب حضرت سلیمان وادیٔ نمل سے گذرے تو وہاں ان کی دعوت ہوئی۔ لیکن دعوت کس نے کی ؟ ثعلبی "کشف الاسرار" میں فرماتے ہیں کہ یہ دعوت چیونٹیوں نے کی (کیونکہ عربی میں چیونٹی کو نمل کہتے ہیں) اور ان کی نمائندہ چیونٹی جس نے حضرت سلیمان سے بات کی تھی اس کا نام طاخیہ تھا۔ اور اس کا قد بھیڑیا حسب بیان تفسیر احقاف بھیڑیئے کے برابر تھا۔ پھر اگر میں یہ کہوں کہ یہ دعوت چیونٹیوں نے نہیں، بلکہ وہاں کے ایک قبیلہ نے کی جس کا نام قبیلۂ نمل تھا۔ تو مجھے منکر قرآن اور کافر کہہ دیا جائے گا۔

یہی صورت معجزات کی بھی ہے کہ یہاں میرا کیا ذکر ہے مولانا شاہ ولی اللہ کو بھی ایسا ہی ویسا مسلمان سمجھا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے بھی کرامات و معجزات کو امور اسبابی میں شامل کیا ہے اور شق القمر کو بھی معجزہ قرار نہیں دیتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ حکایت باوجود لذیذ نہ ہونے کے دراز تر ہوگئی۔ لیکن مختصراً اس طرف اشارہ کرنا ضروری تھا تاکہ آپ کو میرے کفر و اسلام کے متعلق فیصلہ کرنے میں آسانی ہوجائے اور اگر اس کے بعد بھی آپ کا یہی فیصلہ ہو کہ اسلام نام صرف روایت کا ہے اور درایت کا نہیں۔ اور مذہب کا علاقہ عقل سے بالکل نہیں تو پھر میرے حال سے تعرض نہ کیجئے۔ کیونکہ میں بہشت کا سودا عقل سے نہیں کرنا چاہتا اور اُس فردوس سے باز آیا جہاں حسب بیان زہر الریاض ہر جنتی کو پانسو حوریں ملیں گی۔ گو اس لالچ میں کبھی کبھی میرا جی بھی چاہنے لگتا ہے کہ احمق بن جاؤں !

بہر حال ان ہفوات کے ذکر سے میرا مقصود صرف یہ تھا کہ تھوڑی سی روشنی یا تاریکی میری اس زندگی پر بھی پڑ جائے جو بدنامی سے شروع ہوئی اور غالباً اسی پر اسے ختم ہونا ہے۔

اخیر میں چند باتیں مجھے ادارۂ فکر و نظر کے متعلق بھی عرض کرنا ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ اس کی کامیابی کی ذمہ داری جناب جوش کو اپنے سر لینا چاہیے کیونکہ انھیں کے کالم "فکر و نظر" کو سامنے رکھ کر اس کا نام "ادارۂ فکر و نظر" رکھا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس ادارہ کی بنیاد ایسی خاتون کے ہاتھوں پڑی ہے جن کی تعلیم و تربیت فضلائے لکھنؤ میں ہوئی ہے جو حضرت جوش کا بھی وطن ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ عالیہ امام ڈاکٹرنی نہیں بلکہ ڈاکٹر ہیں اردو ادبیات کی اور ان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر شخص سے خراج عقیدت حاصل کریں جو اردو ادب سے دلچسپی رکھتا ہے، جن میں ایک حقیر سی ذات میری بھی ہے، ڈاکٹر عالیہ، میرے ایک نہایت عزیز دوست کی بیٹی ہیں اور چونکہ باپ کا دوست باپ سے زیادہ باپ ہوتا ہے اس لئے وہ میری بیٹی سے زیادہ بیٹی ہیں اور ان کی ہر خواہش کی تکمیل، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں، خواہ اس سے عہدہ برآ ہوسکوں یا نہ ہوسکوں۔

جس حد تک خود عالیہ کی اہلیت کا تعلق ہے۔ وہ صرف ان کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری تک محدود نہیں ہے، بلکہ یوں بھی ان کا مطالعہ علم و فن کافی وسیع ہے اور ایک اچھے مقرر ہونے کی حیثیت سے تو ان کا رشتہ بارگاہ امامت سے بڑھ کر روح القدس تک پہنچتا ہے خواہ وہ عالیہ کے ہم زبان ہوں یا نہ ہوں ——!

# خدا نمبر

## قارئین کے اصرار پر
## بہت جلد
## شائع کیا جا رہا ہے

خدا کیا ہے؟ خدا کا تصور کب اور کیسے پیدا ہوا؟ مختلف مذاہب میں اس تصور نے کس طرح جنم لیا؟ اس کی ارتقائی صورتوں نے تمدنِ انسانی پر کیا اثر ڈالا؟ بندے اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ اس تعلق کی تعبیر کس کس انداز میں کی گئی ہے۔ انبیائے کرام، مصلحین اور مجددین کے ارشادات اس کے متعلق کیا ہیں؟ ان ارشادات کو اقوام عالم نے کس طرح اپنایا ہے؟ اسلام کا موقف اس باب میں کیا رہا ہے اور اس موقف کو مذاہب عالم سے کیوں برتر خیال کیا گیا ہے؟

یہ اور اس قسم کے بہت سے اہم سوالات ہیں جو خدا اور مذہب کا نام آتے ہی ہر باشعور انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں لیکن افسوس کہ اردو میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جو اہل فکر و دانش کی پیاس اس سلسلے میں بجھا سکے۔ نگار کا "خدا نمبر" اس نوع کا پہلا صحیفہ ہے جس میں مذکورہ سوالات کا نہایت مدلل و مشرح جواب دیا گیا ہے۔

قیمت :- تین روپے

# ہماری ادبیات مستقبل میں [۱]

فراق گورکھپوری

اگر مستقبل کے آنے والی صورتوں پر نظر رکھی جائے تو خیالات کی بہت سی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ یہ کہنے کے لئے کہ ساٹھ برس کی دنیا آج سے بالکل مختلف ہوگی پیشین گوئی کی کسی غیر معمولی طاقت کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ہندوستان آزاد فارغ البال اور منظم ہو چکا ہوگا۔ حکومت کا انتظام نہایت عمدہ ہوگا۔ اور ثانوی تعلیم عام ہو چکی ہوگی۔ ذاتی طور سے میرا خیال ہے کہ اس وقت ہمارا سماج اور حکومت اشتراکیت پسند ہوگی۔ ان باتوں کے تصور کے لئے اور آنے والی روشن و خوشگوار صبح کا خیر مقدم کرنے کے لئے کچھ ضروری نہیں کہ آپ ایک زبردست انقلابی ہی ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستانی زبانوں اور ہندوستانی ادب کا اس وقت کیا عالم ہوگا؟ وہ امور جو چالیس کروڑ انسانوں کو پیش آ چکے ہوں گے اور وہ تمام واقعات جو ان کے سامنے رونما ہوں گے، زبان و ادب کو بھی وہی واقعات و امور پیش آئیں گے اور ان پر بھی ان کا اثر پڑے گا۔ آیئے ہم ان کے تصور کی کوشش کریں۔ جب ملک کا ہر باشندہ آزاد۔ فارغ البال اور ترقی یافتہ ہو چکا ہوگا تو ہمارے ادبی مشغلے بے انتہا وسیع ہو جائیں گے اور ادبی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوگا۔ شخصی اور عام کتب خانے۔ کتابیں اور اخبار و رسائل کئی ہزار گنا بڑھ جائیں گے۔ اور یہ اندازہ محض خیال آرائی یا غلو پر مبنی نہیں۔ کیونکہ چالیس کروڑ مشتاق پڑھنے والوں کا تصور کیجئے تو آپ کو خود اس امر کا یقین ہو جائے گا۔

یہ ادبی پیداوار اور مشغلے اردو۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ تامل۔ تیلیگو۔ کناری۔ ملایالم اور غالباً ہندوستان کی دو ایک دوسری خاص زبانوں میں نہ ہوں گے اور زیادہ تر ہر زبان کی معیاری اور ترقی یافتہ شکل میں ظاہر ہوں گے۔ زبان کے اس ارتقائی دور میں جبکہ رفتہ رفتہ معیار کا تعین ہو رہا ہوگا۔ دو طرح کے اثرات پیدا ہو رہے ہوں گے۔ عوام کا دباؤ اور ان گنت انسانوں کا نیچے سے اور ہر چہار جانب سے اثر اس قدر حاوی ہو جائے گا کہ ہر ہندوستانی زبان کی فرہنگ میں ان کے الفاظ، محاورات۔ فقروں اور بولی ٹھولی اور عام طرز گفتگو کا، جو اب تک ہمارے ادبی حدود سے خارج رہے ہیں، ایک سیلاب سا آ جائے گا۔ اور اسی کے مقابل دماغی۔ علمی۔ جمالیاتی اور حسن کار طبقے اور شخصیتیں اس خارجی اور اندرونی سیلاب کے ساتھ آنے والے الفاظ و محاوروں کو ایسے سانچے میں ڈھالیں گی اور ایسی شکل و صورت عطا کریں گی جو ان کو ادبی قیمت و استقلال بخشے گی۔ ہر زبان کی ارتقا سماجی تبدیلیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ہر زبان کی تاریخ اس کے الفاظ میں وسعت، قوت، جذب۔ ٹھہراؤ اور روانی پیدا کرنے اور ان کے باہمی گھلنے ملنے سے نئی شکلوں۔ نئے معنے اور نئے مشتقات مرتب ہونے کی ایک داستان ہوا کرتی ہے۔ جس طرح معاشیات میں جمہوری نظام کی خصوصیت ہے کہ نئی صورتیں بنتی ہیں پھر بگڑ جاتی ہیں

---

[۱] فراق کے اس انگریزی مقالہ کا ترجمہ احمد حسین نے کیا ہے۔

اور ان کے اس بناؤ بگاڑ کے باہمی اثر سے پھر نئی شکلیں وجود میں آتی ہیں۔ اسی طرح زبان بھی ایک جدلی اصول ارتقا کے ماتحت بڑھتی اور ترقی کرتی ہے۔ عوام کی زبان۔ ڈھیلی بے جوڑ۔ بے رنگ اور بھدی ہوا کرتی ہے۔ اور ایسی زبان ادب نہیں ہوا کرتی اور نہ یہ تحریر کی زبان ہوا کرتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ ادب خام اور زبان خام ہے۔ لیکن ایک تعین معیار کے دور سے گزرنے کے بعد زبان اپنے اعضا، رگوں اور نسوں میں ایک سختی سی محسوس کرنے لگتی ہے الغرض گویا ہر زبان میں عوام سے، اثر پذیری اور "تعین معیار" کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی خاص زبانوں میں نئی سادگیاں۔ نئی پیچیدگیاں۔ نئے تشبیہی اقسام اور نئے معنوی اختلافات نئی آزادیاں اور نئی پابندیاں پیدا ہو جائیں گی۔

دو ہزار برس سے زیادہ ہوا کہ یہ ہندوستانی زبانیں عوام کی عام بولی کی حیثیت سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں پھل پھول رہی تھیں۔ ان میں نہ تو ستھرا پن آیا تھا اور نہ انھوں نے معیاری حیثیت حاصل کی تھی۔ ان میں سے ہر ایک زبان کی بیسیوں مختلف قسمیں تھیں۔ ان زبانوں کا کوئی ادب نہ تھا۔ سارے ہندوستان میں ادب کی زبان صرف سنسکرت تھی۔ لیکن سنسکرت میں سختی پیدا ہو چکی تھی۔ اور اب وہ ہندوستانی باشندوں کے کسی گروہ کی بھی بول چال کی زبان نہ رہی تھی۔ اس کے بعد سنسکرت میں دفعتاً تنزل پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور مہاتما بودھ کے عروج کے ساتھ پالی اور پراکرت ادب پیدا ہونا شروع ہوا اسی سلسلے میں اس موقع پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ پالی اور پراکرت "بولیوں" کا وجود مہاتما بودھ کا رہین منت نہیں۔ یہ بولیاں سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل کی حیثیت سے پہلے ہی رائج تھیں۔ بودھ جی کی وجہ سے صرف زبانوں کا ادب پیدا ہوا۔ (یہ حیرت انگیز حقیقت ہے کہ یورپ میں بھی اسی طرح یورپ کی مختلف قوموں اور نسلوں میں جو لاطینی زبان سے نکلی ہوئی مقامی بولیاں رائج تھیں۔ ان میں سے ایک رومانوی ادب پیدا ہونے لگا تھا)۔ الغرض اس وقت کی خاص خاص ہندوستانی زبانوں کی پیدائش پراکرت، پالی اور سنسکرت سے نکلی ہوئی دوسری بولی جانے والی زبانوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا تھا کہ جب یہ زبانیں وسیع ہوں گی اور نہ صرف اپنی عام بول چال بلکہ دوسری زبانوں کی بولی ٹھولی کو اپنے اندر جذب کر لیں گی تو گویا ہر زبان کے حدود مستقل طریقے سے متعین کئے جا سکیں گے۔ ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ساٹھ برس کے بعد عام ثانوی تعلیم استقلال اور مضبوطی سے رائج ہو چکی ہوگی۔ لیکن (BACON) نے کہا تھا کہ تصنیف و تحریر آدمی میں درستی و صحت کا مادہ پیدا کر دیتی ہیں۔ تحریر سے زبان میں بھی درستی و صحت کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہندوستان میں جس قدر جدت اور سائنٹفک ترقی بڑھے گی اتنا ہی زندگی اور زبان کا ایک معیار پیدا ہوتا جائے گا۔ لیکن زندہ اور مربوط نظم کے بغیر اس وسعت پذیری کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ گویا اس طرح ہر ایک زبان کا ایک معیار اور ایک مانوس انداز ہوگا لیکن اسکی شکل اور زبان کا کوئی مقامی عنصر ادبی حدود سے خارج نہ ہوگا۔ پیشہ وروں کی بول چال۔ مقامی بول چال۔ یہ سب کم و بیش ادبی حدود میں داخل ہوں گے۔

ہندوستان کی یہ خاص زبانیں زیادہ ترقی اور جرات کے ساتھ اپنے اندر لچک اور وسعت پیدا کریں گی۔ تاکہ ہر طرز گفتگو کو شامل کر کے ان کو مضبوط تر بنا دیں۔ کئی وجوہ سے آج کل کی تحریر کی زبان زیادہ ڈرامائی اور واقعاتی سی بن رہی ہے۔

آجکل عالمانہ "حلقے" جو دقیق و پیچیدہ الفاظ کی طرف مائل ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں اس تحریک سے کافی پریشان اور متاثر ہیں کہ ہندوستانی زبانوں کو عوام کی سمجھ، عادات اور ان کے تخیلی اور جذباتی گفتگو کے محاورات سے زیادہ قریب لانا چاہیئے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ زبان و ادب کو "مخصوص پسند" نہیں ہونا چاہئے اور اس خاص طبقہ کی ملکیت نہ بن جانا چاہئے

لیکن ادب بے جان حد تک نہیں گرایا جاسکتا، الفاظ و اسلوب کی یک رنگی نہیں پیدا کی جاسکتی کیونکہ اس سے ادب بے جان ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور سے وکٹوریہ کے وسطی عہد کو لے لیجئے۔ اس عہد کے اسالیب بیان میں حیرت انگیز حد تک تنوع تھا۔ لیئر کے الہامی مہملات۔ کارلایل کی آتش فشاں طرز نگارش۔ میکالے کے پرجوش جملے۔ رسکن کی زرّیں و پرشوکت نثر۔ نیومین کے پاک و لطیف محاسن۔ میتھو ارنلڈ کا مجتہدانہ اسلوب۔ تھیکرے کا الفان انگیز مکالماتی انداز۔ اسٹیونسن کا جذباتی طرز۔ والٹیر پیٹر کی تجزیہ نگاری۔ یہ سب کچھ آپ کو ملے گا۔ خود شیکسپیر کے یہاں اگر ایک طرف جاہلوں کو خوش کرنے والی زبان پائی جاتی تھی تو دوسری طرف اس کے غلو کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گویا اس دنیا کی چیز ہی نہیں۔

میں نے اب تک ان تبدیلیوں کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنی زندہ و مربوط ترقی کے دور میں ہندوستان کی خاص زبانوں میں واقع ہوں گی۔ اور جن کی ہمیں آنے والے عہد میں امید رکھنی چاہئے۔ ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں کجری۔ برہا۔ دیہاتی گیت۔ عوام کی کہانیاں۔ تک بندیاں پیدائش موت کے گانے۔ مزدوروں کے گانے۔ سپیروں کے گانے جادوگروں کے گانے اور منتر موجود ہیں۔ لیکن ان کا صرف ایک غیر محسوس سا وجود ہے۔ ان کو بہت جلد جمع کرکے نشر کرنا ہوگا یہی حال عوام کی کہاوتوں ضرب الامثال اور مخصوص بولیوں کا ہوگا۔ اس کے بعد ان چیزوں کا ادبیات کے اندر دخل و جذب کا عمل شروع ہوگا۔ اور اسی کے ساتھ ان زبانوں کے غیر متعین حدود متعین ہونا شروع ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی حدود ختم ہوکر عام سماجی مساوات کے قیام کا عمل بھی جاری ہوگا جس سے نئے سماجی پہلو نمودار ہوں گے۔ ہندوستانی عوام کے صبر و اطمینان سے پہلے ہی سے حرکت پیدا ہوچلی ہے۔ اور اب یہ تحریک تیز و شدید ہوتی جارہی ہے۔ اس لئے عام ثانوی تعلیم کی وجہ سے ہندوستان کی یہ خاص زبانیں زیادہ مضبوط و مستقل ہوجائیں گی۔

زبانوں کی وسعت کا ایک دلچسپ اور اہم نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ان میں ان علمی اور اصطلاحی الفاظ کا سیلاب آجائے گا۔ جو مختلف آلوں یا مشینوں سے متعلق ہوں گے۔ یہ الفاظ اکثر موقعوں پر بالکل بدیسی ہوں گے اور بعض اوقات انھیں ہندوستانی شکل بھی دی جائے گی۔ البتہ کبھی کبھی خالص ہندوستانی اصل کے الفاظ بھی ملیں گے۔ عوام و خواص دونوں ان الفاظ کی تشکیل و رواج میں حصّہ لیں گے۔ آج ہماری تصنیفات کے بیانی واقعاتی اور تخیلی حصوں میں ریل۔ فن۔ ہوابازی۔ جہاز رانی۔ فیکٹریوں دواؤں۔ جراحی۔ انجنیری وغیرہ کے مختلف الفاظ بالکل مفقود ہیں۔ پروفیسر سینٹبری (Saintsbury) نے لکھا ہے کہ لائف آف نلسن[1] لکھتے وقت ساؤدی کو بحری زندگی سے متعلق ایسے فقروں سے سابقہ پڑا اور اتنی ہوشیاری کی ضرورت پڑی ہے گویا بلّی چینی کے برتنوں سے گزرے۔ ساؤدی کی "لائف آف نلسن" اور کونارڈ کے ناولوں کے پڑھنے والے اس کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان میں کتنی کثرت سے علمی اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے۔ ہارڈی نے نجومی حقیقتوں اور شکلوں کے جس قدر ضمناً تذکرے کردئے ہیں اور مزدوروں یا کسانوں کی زندگی کے جیسے مانوس نقشے پیش کئے ہیں وہ قارئین کے لئے بیک وقت دلچسپ بھی ہیں اور صبر آزما بھی اس میں شک نہیں کہ فرنگی زبانوں کے اثر سے ہماری زبان اس رنگ کو قبول کررہی ہے۔ لیکن ابھی تک صرف ذہنی اور تخیلی ادب میں اس کا اثر ہورہا ہے اور عوام کی متنوع زندگی سے متعلق ہونے والے الفاظ کی بہت کمی ہے۔ سوامی رام تیرتھ نے امریکہ کے باشندوں پر فخر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ ہرچند وہاں کی ابتدائی کتابیں بلی اور کتے سے شروع ہوتی ہیں۔ اور ہماری کتابیں ہمیشہ خدا سے شروع ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ سوال کر بیٹھے کہ کیا اسی وجہ سے

[1] (NELSON) مشہور انگریز امیر البحر کا نام ہے جس نے نپولین کے مشہور فرانسیسی بیڑے کو شکست فاش دی اور اسی جنگ میں مارا گیا۔ انگریزوں کا زبردست قومی ہیرو ہے اور ساؤدی نے اس کے سوانح حیات لکھے ہیں۔

فطرت اور حقیقت پر ہماری گرفت ڈھیلی نہیں پڑ گئی ہے تو ہم کیا جواب دیں گے؟ الغرض ہمارے ادب کو اب فطرت و حقیقت پر زیادہ مضبوط گرفت حاصل کرنی ہے۔ دماغ اور ہاتھ کی باہمی بیگانگی کا دور کافی طویل ہو چکا ہے۔ ہتھوڑے اور ہنسیا کو بھی ہمارے ادب میں مناسب جگہ ملنا چاہئے اور حقایق زندگی کو ہندوستان کے ادبیات میں زیادہ سے زیادہ نمایاں ہونا چاہئے۔ اس جگہ شیکسپیر مجھے یاد آتا ہے جس کے ادبیات کے تنوع کو دیکھ کر کارلائل نے کہا ہے کہ اگر وہ کوئی بڑا شاعر نہ ہوتا تو ایک بڑا سپاہی ہوتا یا بڑا کسان یا بڑا دستکار۔ بہرحال زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی حیثیت ممتاز ہی رہتی۔

اب یہاں بعض اصولی مسائل سامنے آتے ہیں تہذیب نے ادب کی طاقت اور امکانی قوتوں کا بہت دھندلا سا اندازہ کیا ہے۔ ابھی عام اور موثر طریقے کی ثانوی تعلیم کا نفاذ تو نہیں ہوا لیکن ہم اس عہد سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اور وہ منزل دور نہیں کہ ہم اپنے اس خواب کی عملی تعبیر دیکھ سکیں۔ اس دور کا سب سے زیادہ اہم سوال اور ہماری اجتماعی زندگی کا سب سے زیادہ نازک مسئلہ "بچے اور ان کا ادب" ہے۔ سن رسیدہ آبادی بڑھ کر ویسی ہی ہوگی جیسے ہمارے بچے ہوں گے۔ ہم کو بہت جلد بچوں کے لئے لاکھوں کتابوں کی ضرورت پڑنے والی ہے۔ علم ہجا اور شروع کی پرائمروں سے لے کر احمقانہ و عقلمندانہ نثر و نظم۔ سبق آموز کہانیوں، تمثیلوں جن و پری کی کہانیوں، سیاحتوں، ہمت افزا داستانوں۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ سوانح حیات مضامین۔ ناول۔ ڈرامے۔ روزمرہ سائنس کی کتابوں۔ قاموس و لغات۔ میگزین و تصویروں کے البم اور نقشوں تک ہر چیز کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے ہم کو بہت جلد اس کی فکر کرنی چاہئے کہ مصنفوں۔ مؤلفوں مترجموں اور اڈیٹروں کی ایک پوری فوج اس کام میں منہمک ہو جائے۔ اور موجودہ صدی کے ختم ہوتے ہوئے اس مقصد میں کافی کامیابی حاصل ہو جائے۔ یہ اتنا مفید کام ہے کہ ہماری صوبجاتی حکومتوں لیڈروں اور ماہرین تعلیمات سب کو ملکر اس طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ شیر خواری سے چودہ برس کی عمر تک یہ نہایت اہم اور ضروری امر ہے کہ ہر لڑکے اور لڑکی کی اپنی ضرورتوں کے مطابق بہترین ادب تک آسانی سے رسائی ہو سکے۔ اس کے علاوہ بچوں کے ادب میں بالغوں کے ادب کا بھی اچھا خاصہ حصہ بچوں کے مذاق کے مطابق کاٹ چھانٹ کر شامل کرنا ہوگا۔

ہرچند مطالعہ کی عادت سے جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا دارومدار زیادہ تر شخصی رجحان پر ہے لیکن اگر ہم چاہیں تو اس میں مسلسل ترقی پیدا کر سکتے ہیں۔ بچوں کے مطالعہ کو بے لطف خشک اور مشکل کتابوں تک محدود رکھنے سے یہ تو ممکن ہے کہ آپ سو فیصدی میٹرک اور لاکھوں گریجویٹ پیدا کرلیں لیکن آپ مطالعہ کو ایک قوی عادت بنانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آپ کی قوم دلچسپی لے کر پڑھنے والوں کی نہیں بلکہ کلرکوں کی قوم ہوگی۔ مطالعے کی عادت یا سوچنے اور رائے قائم کرنے کی عادت ابتدائے عمر ہی میں پڑ جانی چاہئے۔ بعد کے سالوں میں اس میں صرف پختگی پیدا ہوتی ہے۔ ہم اس اہم نفسیاتی حقیقت کو اکثر بھول جاتے ہیں کہ بچے کتابوں اور مطالعے کو پسند کرتے ہیں اور ہم یہ کرتے ہیں کہ یا تو ان کی اس ذہنی اشتہا کو ختم کر دیتے ہیں یا پھر غیر مناسب اور تھکا دینے والی کتابیں دے کر ان کے دل سے مطالعہ کی تمام محبت کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس افسوسناک صورت حال کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ کچھ ایسی نظموں۔ کہانیوں یا کتابوں کو یاد کرنے کی کوشش کیجئے جن کی یاد اب بھی آپ میں غیر معمولی جوش و حسرت پیدا کر دیتی ہو اور جنھوں نے آپ کے عہد طفلی کو روشن کر رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ مشکل ہی سے دو ایک ایسی مثال یاد کر سکیں یا ممکن ہے کوئی یاد نہ آئے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے گریجویٹ نوے فیصدی (جہاں تک مطالعہ کی قوی عادت کا تعلق ہے) ان پڑھ زندگی بسر کرتے

ہیں۔ اخباروں پر وقتی طور سے، معمولی دلچسپی کے ساتھ نظر ڈال لینے کے علاوہ جس میں غور و فکر کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہوتا وہ شاید اور کچھ نہیں پڑھتے۔ یہ تمغے کا دوسرا رُخ ہے۔ اور ہندوستان میں انگریزی تعلیم پر میکالے کی مشہور رپورٹ کی دوسری توضیح۔ شاید میکالے کی متجسس نگاہوں کیلئے یہ مسئلہ اس قدر واضح تھا کہ وہ اس کو نہ پا سکے۔ سال بہ سال ہم لوگوں کو یونیورسٹی میں سیکڑوں انڈر گریجویٹوں سے سابقہ پڑنے کا صبر آزما اور تکلیف دہ تجربہ کرنا پڑتا ہے۔ قابل افسوس امر یہ نہیں ہے کہ ان کا دماغ الجھا ہوا ہوتا ہے قابل افسوس امر یہ ہے کہ ان کا دماغ بالعموم خالی رہتا ہے اور حقیقتوں سے انکو کوئی ذوق نہیں ہوتا۔ اپنے ذہنی خلا کے باعث وہ بالکل مردہ دیوار کے مانند ہو جاتے ہیں ان کو ذہنی اخذ سے ایک فطری مخالفت سی ہو جاتی ہے اور کسی چیز پر بحث کرنے یا غور کرنے یا کسی سوال کے پوچھنے یا اس کا جواب دینے سے قطعاً گریز کرنے لگتے ہیں ان کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ محض طلبار کی غلطی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ بے چارے تو ایک ایسے بے رحم نظام کا شکار ہوتے ہیں جو بے ضرورت دباؤ۔ غلامی مفلسی۔ اقتصادی لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہوتا ہے اور تمدنی ترقی کو شروع ہی سے الجھاووں میں پھنسا کر بالکل خاتمہ کر دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی طفلی اور شروع جوانی کے درمیان میں لڑکے اور لڑکیوں کی انگلیاں اور نگاہیں ایسے لاکھوں صفحوں سے گزرتی ہیں جو نوخیز عمر والوں کے استعمال کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں اور جوان کی مناسب ذہنی غذا کا کام دے سکتے ہیں۔ بچوں کے کثیر اور تندرست ادب کے بغیر قوم کی ذہنی بھوک شروع ہی میں مر جاتی ہے۔ بچوں کی مناسب کتابوں کا کال ان کے جوشیلے ذوق کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ ان کے دل ریگستان میں پیدا ہونے والے پھولوں کی طرح خاموشی سے کمھلا جاتے ہیں۔ اپنی قومی زندگی کے گہوارہ اور بنیاد سے بیگانہ رہنے میں ہمارے لئے زبردست خطرے ہیں اور پھر اب تو اس بے نیازی کی بھی انتہا ہو گئی۔

اس لئے اگر آئندہ صدی تک ہمیں کچھ کرنا دھرنا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ابھی سے نوخیزوں کے لئے مناسب متنوع اور متدارج ادب کی کافی پیداوار پیدا کریں اور عام استعمال کے لئے نہایت وسیع اور ہمہ گیر طریقۂ عمل ہوشیاری سے مرتب کریں۔ مناسب ہو گا کہ ایک دو الفاظ میں اس کا بھی تذکرہ کرتا چلوں کہ یہ کتابیں کس طریقہ کی اور کن خصوصیات کی حامل ہوں گی۔ میری رائے سوامی رام تیرتھ کے اعتراض کے باوجود یہی ہے کہ بچّوں کی کتابوں میں خدا نہیں بلکہ کتے اور بلی کا عنصر زیادہ ہونا چاہئے۔ بچّوں کا وجود بالکل فطری وجود ہوتا ہے۔ ان کو نہ مذہب سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے نہ اخلاقیات سے۔ اب وہ دور ختم ہو چکا ہے۔ جبکہ بچّوں کی کتابوں کی بنیاد مذہبی اور اخلاقی کلیات پر رکھی جاتی تھی۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس امر میں ان کی مدد کریں کہ پرانے وراثتی تعصبات اور نفسیاتی کمزوریوں سے آزاد ہو کر سوچیں اور سمجھیں۔ مذہبی اور اخلاقی تربیت کی جگہ اب ذہنی اور فراستی تعلیم کو لے لینی چاہئے تاکہ دل و دماغ اور ہاتھوں کے تعاون سے ایک نیا اور معقول تمدن پیدا کیا جا سکے۔ احترام کا جذبہ خدا کے ماننے پر مبنی نہیں ہے نہ کسی مخصوص مذہب یا عقیدے کا ٹھیکہ ہے لہٰذا بچوں کے ادب میں مذہب اور اخلاقیات کا نہیں بلکہ ٹھوس مادی چیزوں کا پلہ بھاری ہونا چاہئے۔ بچّوں کا ادب بناتے وقت سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ پڑھنے والوں میں فطری اور سماجی اصولوں سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ بچے بے حقیقت ہوائی باتوں سے تھک جاتے ہیں اور عام اخلاقی ہکواس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ فرینکلن کی (My Autobiography) سے لے کر سیموئیل اسمائیلس کی (Self help) تک اس قسم کا تمام ادب ایک ناقابلِ فہم دور سے آنے والی چیخ معلوم ہوتا ہے دوسرے قصے میں سرمایہ کی طرف سے ہمکو خوفزدہ

بنا دیتے ہیں۔ بچوں اور نوخیزوں کے لئے جو ادب ہے۔ اس میں ہمیشہ ایک مخصوص سماجی مقصد کی جھلک ہونی چاہیئے اور ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں موجودہ سماجی نظام کی مخالفت کرنا پڑے گی اور یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ بچوں کا ادب نہ صرف تعمیری بلکہ تخریبی بھی ہوتا ہے۔ سورماؤں کی کہانیاں۔ کنگسلے کے افسانے۔ یا پلوٹارچ کی تاریخی کہانیاں فائدہ مند بھی ہیں اور مضر بھی کیونکہ نوخیزوں میں وہ ذاتیات کے جذبات بھی ابھارتی ہیں۔ میں مانتا ہوں گو ایسی کہانیاں اور خصوصیت سے پلوٹارچ عمر رسیدہ کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ لیکن نوخیزوں کی زندگی کے تشکیلی اثرات میں ان کی تقابلی اہمیت بہت بدل جائے گی وہ سورما نہیں جو اپنے علاوہ اور کسی کے لئے سورما نہ تھے۔ بلکہ سورما وہ تھے جو بڑی بڑی تعمیری مہمات کے سرگردہ تھے۔ اس لئے ان کے سوانح حیات ایسے صاف اور مانوس انداز میں پیش کرنا چاہیے کہ نوعمروں کے نوخیز ترقی پسند احساس کو بھلا معلوم ہو۔ لیکن ان کو ایک رخی تعریف پر ختم نہ ہونا چاہیئے۔ ان کی زندگی کی محدود حیثیتیں۔ ان کے مانے ہوئے مہلک اصول اور مسلمات بھی صاف صاف بتا دینا چاہیئے۔ ہمارے سورما اچھے ہوں یا برے لیکن بچوں میں سورما پرستی کے جراثیم نہ پیدا کرنا چاہئیں۔ تاہم طرز نگارش کچھ ایسا ہونا چاہیئے جو نوخیز قارئین کے دلوں میں احترام کے جذبہ کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دے۔

ان اہم امور کو مدنظر رکھتے ہوئے سوانح عمریوں کی ایک قومی بلکہ بین الاقوامی قاموس کا کام فوراً شروع ہو جانا چاہیئے بچے صرف بچے ہی نہیں ہوتے اور نہ سب لوگ ایک سے ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہوتے ہیں۔ کھیل کا فطری مادہ اور ذہنی رجحان جو اپنی مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا ہے، یہ دونوں تہہ میں درحقیقت ایک ہی چیز ہیں، بربری اقوام بھی فلسفہ دان۔ سائنس دان۔ موجد۔ حسن کار سیاح۔ تجار ناظم اور رہنما ہوتے ہیں۔ خارجی اور داخلی اسباب نفسیاتی وجوہ اور تمدنی، تاریکی ماحول کی وجہ سے ہمارے ہندوستانی بچے مغربی بچوں سے زیادہ تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔ بچوں کا ادب بنانے والوں کو ارزاں حب الوطنی اور ناقابل برداشت طفلانہ پن سے احتیاط لازم ہے۔ بچوں کی کتابوں کو وسیع حدود اور متنوع اقسام کا ہونا چاہیئے جس میں ایسی لطیف اشارہ انگیزی پائی جاتی ہو کہ بیک وقت روشن دماغی۔ اضافۂ معلومات اور تجسس ذہنی پیدا کرے۔ کیوں نہ ہم دور جدید کی ایک نئی ( Hitopadesh ) ایک نئی (ایسوپ Aesop) اور ایک نئی جنگل کی کتاب پیدا کریں جو عصر جدید کے ترقی یافتہ اور اضافہ شدہ علم پر مبنی ہو۔ ڈارون، ویلس، میٹرلنک، اور کروپوٹکن ایسے مصنفین کی کتابوں کے اقتباسات اور سائنس کے عجائبات کے تذکرے جب کروڑوں لڑکوں کے سامنے پیش ہوں گے تو ملک کے اس نوخیز طبقے میں ایک ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی ترقی کی لہر دوڑ جائے گی۔ جنسیات کے مشکل مسائل کو بھی کافی ہوشیاری اور توجہ کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ ایک ایسا سماجی احساس پیدا کرنے کے لئے جو پوری دنیا پر محیط ہو۔ ایک تشدد آمیز قومیت یا فرقہ پرستی کے جذبات کو روکنے کے لئے رجعت پسندانہ ذہنیت کو کچلنے کے لئے ( Martyrdom of man ) (انسان کی شہادت) ایسی کتابوں کو کافی ہردلعزیز بنانے کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ نہ صرف ان کے دماغوں بلکہ ارادوں کو بھی مناسب تربیت و ترقی ہو سکے۔ شہنشاہیت سرمایہ داری اور مذہب اس عمل کو مدتوں سے روکتے رہے ہیں۔ اس لئے بغیر کسی رعایت کے ان کا بھرم کھولنا چاہیئے۔ مافوق الانسانی طاقتوں کی عقیدتمندی کو بھی ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے لئے شاعری اور روحانیت کا خاتمہ ضروری نہیں۔ سائنٹفک خیالات کا انداز بھی کوئی بھدا اور غیر لطیف انداز نہیں ہے۔ آغاز کائنات کا مسئلہ — جغرافیہ۔ باغبانی۔ علم حیوانات۔ علم النباتات۔ علم النسل اور معاشیات یہ سب ضمیر کی پوری پابندی کے ساتھ بچوں کو

حاصل کرانے چاہئیں۔ بچوں کی کتاب کو کند، بے لطف اور پھیکا بنا دینا سب سے بڑی خرابی ہے اور یہ پھیکا پن عموماً سطحی اور محدود علم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سماجی احساس۔ سماجی ارادہ و مقصد اور سماجی خیالات کو بچوں کی ذہنی زندگی کا ضروری جزو بنا دینا نہایت ضروری ہے۔ مجھے یہ محسوس کرکے شدید تکلیف ہوتی ہے کہ ہمارے مشاہیر میں بھی سماجی احساس کا فقدان ہے۔ آج متوسط طبقے کی رسمی نیکیوں سے کام نہیں چلے گا بلکہ ہم کو صرف مفید چیزوں کی ضرورت ہے۔ ہم کو ایسی کتابیں چاہئے۔ جن میں تصویریں ہوں، گانے ہوں، نظمیں ہوں، کہانیاں ہوں، مکالمے ہوں۔ ظرافت ہو، سائنٹفک معلومات ہوں، ایجادات کی کہانیاں ہوں۔ لطیفے ہوں، نقشے ہوں، معمے اور پہیلیاں ہوں اور مذہبیات و اخلاقیات سے ان کو کوئی لگاؤ نہ ہو۔ سماج کو بھی زندہ صفت اور زندگی بخش ادب کی پیداوار مہیا کرنے کا فن سیکھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ تمام صوبوں کے وزرائے تعلیم کو فوراً اس اسکیم پر کاربند ہونا چاہئے اور قابل آدمیوں کی ایک جماعت تلاش کرکے ایک مرکزی ادارہ تعمیر نصاب کا قائم کرنا چاہئے۔


# چند کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| اوراق گل | ضمیر احمد ہاشمی | ۸ روپے ۷۵ پیسے |
| انشائے ماجد (حصہ اول) | عبدالماجد دریابادی | ۵ روپے ۵۰ پیسے |
| انشائے ماجد (حصہ دوم) | عبدالماجد دریابادی | ۶ روپے |
| اسلامی سوانح عمریاں | عبدالحلیم شرر لکھنوی | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| دربار اکبری | مولوی محمد حسین آزاد | ۲ روپے |
| تاریخ ویدی لٹریچر | حکیم احمد | ۴ روپے ۵۰ پیسے |
| مضامین شرر | عبدالحلیم شرر | ۵ روپے ۲۰ پیسے |
| گزشتہ لکھنؤ | عبدالحلیم شرر | ۵ روپے ۶۰ پیسے |
| فیروز شاہ تغلق | صادق حسین سردھنوی | ۴ روپے ۵۰ پیسے |
| عالمگیر | صادق سردھنوی | ۸ روپے ۵۰ پیسے |
| آدم خور | مظہر الحق علوی | ۶ روپے ۵۰ پیسے |

منیجر:۔ نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

# نگارِ پاکستان

کا

## خصوصی شمارہ

# مومن نمبر

عنقریب شائع کیا جارہا ہے

مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے

جو شیخِ حرم بھی ہے اور رندِ شاہد باز بھی

اِس لئے

اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک غیر معمولی کشش کی جاذبیت ہے

یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوتی ہے اور اس میں اہلِ ذوق کے لئے

لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اس کا صحیح اندازہ

## "مومن نمبر"

کے مطالعہ سے ہوگا

اس نمبر میں مومن کی سوانح ـ حیاتِ معاشقہ ـ اس کی غزل گوئی ـ قصیدہ نگاری مثنویات و رباعیات اور خصوصیاتِ کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہو گیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کر کے مومن پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے۔

قیمت :- تین روپے ـــــ خریدارانِ نگار کے لئے رعایتی قیمت :- دو روپے

# چند تاریخی و ادبی لطائف

نیاز فتحپوری

(۱)

ایک شعر ہے :۔

سبزدار ست ایں جہانِ بے مداد　　　ہمچو بوبکریم در وے خوار وزار

حضرت ابوبکر ! اور خوار وزار !! کتنا کھلا ہوا تبرّہ ہے کیسی سخت توہین ہے رسول اللہ کے خلیفہ اوّل کی۔ یقیناً یہ شعر کسی غالی شیعہ ہی کا ہو سکتا ہے ۔۔۔ لیکن آپ کو حیرت ہوگی یہ سن کر کہ یہ ارشاد ہے مولانا جلال الدین رومی کا جن کی مثنوی کو ؎　　ہست قرآں در زبان پہلوی

کہا جاتا ہے۔

---

سبزدار۔ ایران کا ایک مشہور مقام ہے جہاں کسی وقت خالص شیعوں کی آبادی تھی اور اپنے تعصب کے لحاظ سے کافی نیک نام یا بدنام۔ جب سلطان محمد خوارزم شاہ نے ایران فتح کیا اور سبزدار پہنچا تو اس شہر کی خصوصیت کا علم اسے بھی ہوا یہ بڑا سخت گیر سُنّی تھا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ یہاں کے باشندوں کو سخت سزا دینا چاہیے اس نے یہاں کے اکابر کو بلایا اور پوچھا کہ "تم لوگ شیعہ ہو یا سنی" انھوں نے جواب دیا کہ ہم سب سنی ہیں۔" خوارزم شاہ نے کہا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو اپنی جماعت میں سے کوئی ایسا شخص پیش کرو جس کا نام ابوبکر ہو۔ یہ لوگ گئے اور بڑی مشکل سے ایک نہایت ہی ضعیف اور خستہ و خوار شیعہ کو بہت کچھ دے دلا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنا نام ابوبکر بتائے۔ چنانچہ یہ اسے لیکر خوارزم شاہ کے پاس گئے۔

بادشاہ نے پوچھا "یہ کون ہے جو نہ مردہ ہے نہ زندہ"

سبزدار والوں نے جواب دیا کہ "جہاں پناہ، ہمارے شہر میں اس سے بہتر ابوبکر اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن ہے ابوبکر ہی"۔

بادشاہ یہ سن کر ہنس پڑا اور عتاب کا خیال ترک کر دیا ۔۔۔"

مولانا رومی نے اس شعر میں اس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہماری حالت اس دنیا میں اسی ابوبکر کی طرح ہے جسے سبزدار کے لوگوں نے سلطان خوارزم شاہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

---

مولانا رومی کا ایک اور شعر اسی قسم کا ہے۔

کور کورانہ مرد در کربلا    تا نیفتی چوں حسین اندر بلا

بظاہر اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ "کربلا میں اندھوں کی طرح داخل نہ ہو ورنہ حسین کی طرح مصائب میں مبتلا ہو جاؤ گے" اور یہ بڑا سخت حملہ ہے جانب حسین پر۔ لیکن غلطی دوسرے مصرع کے لفظ تا سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس کے معنی تاکہ قرار دیا جائے تو مفہوم یقیناً وہی پیدا ہوگا جو ابھی ظاہر کیا گیا۔ لیکن مولانا رومی نے اسے جب تک کے مفہوم میں استعمال کیا ہے اور اس صورت میں شعر کے معنی یہ ہو جائیں گے کہ جب تک تم حسین کی طرح بالکل مجبور نہ ہو اس وقت تک بے سمجھے بوجھے اپنے آپکو مصیبت میں مبتلا نہ کرو

( ۲ )

جب "المنصور" دوسرا عباسی خلیفہ، مسند خلافت پر بیٹھا تو دمشق کے تمام اکابر و امرار، مبارک باد کے لئے حاضر ہوئے ان میں ایک شاعر "ابن ہرمہ" بھی تھا، جو مدینہ میں رہتا تھا اور شراب کا سخت عادی تھا۔

منصور نے منجملہ اور لوگوں کے اس سے بھی پوچھا کہ "بتاؤ کیا چاہتے ہو"۔

اس نے کہا "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے عامل مدینہ کو ہدایت کر دیجئے کہ اگر وہ کبھی مجھے عالم سکر میں پائے تو مجھ پر حد جاری نہ کرے۔ اور درے نہ لگائے۔

منصور نے کہا کہ "یہ ممکن نہیں۔ خدا کے حکم میں دخل دینے کی جرأت میں کبھی نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اور کچھ چاہتے ہو تو کہو"

ابن ہرمہ نے کہا "آپ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اپنے عامل مدینہ کو یہ ہدایت کر دیجئے کہ اگر ابن ہرمہ نشہ کے عالم میں سامنے لایا جائے تو بے شک اس پر حد جاری کرو اور ۸۰ درے لگاؤ، لیکن اس کے ساتھ وہ شخص جو اسے پکڑ کر لایا ہے۔ سو درے اس کے بھی لگائے جائیں "

( ۳ )

ایک بار تبریز کے شیخ الاسلام نے ملا محمد عصار کو جو اپنے عہد کا مشہور شاعر تھا۔ از راہ لطف و کرم اپنا ایک جبہ مرحمت فرمایا جو حد درجہ بوسیدہ اور تار تار تھا۔ شیخ الاسلام کا عطیہ تھا، انکار کیسے کرتا، شکریہ ادا کیا، سر آنکھوں پر رکھا اور بغل میں دبا کر گھر لے گیا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ بر بنائے رسم و تہذیب یہ جبہ پہن کر اسے عرض تہنیت کے لئے پھر جانا بھی چاہئے تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اسے پہن کر شیخ الاسلام کے پاس جائے اور یہ رسم ادا کر دے۔ لیکن جبہ میں جان ہی نہ تھی کیا پہنتا اور کیا جاتا۔ اس لئے وہ خود تو شیخ الاسلام کے پاس گیا نہیں البتہ یہ چند اشعار معذرت کے طور پر لکھ کر بھجوا دیئے۔

جامۂ بخشید شیخ اسلام اعظم بندہ را
وہ مبارک جامۂ سال فراواں یافتہ

رشتۂ حوا از برائے آدمش در بدر حال
زمیش در کارگہ از بہر عیسیٰ بافتہ

وانگہ از مقتول ہشتم نافۂ پیغمبرش
فاطمہ گشتہ رفوگر ہر کجا بشگافتہ

من چہ حد دارم کہ پوشم جامۂ راں کاندرو    آفتاب طلعت چندیں پیمبر تافتہ

(شیخ الاسلام نے مجھے ایک حلہ مرحمت فرمایا جس کے تقدس ندامت کی تعریف نہیں ہوسکتی ۔ اول اول حوا نے اپنے آدم کے لئے اس کا تاگہ بٹا۔ پھر مریم نے اس سے عیسیٰ کی پوشاک تیار کی ۔ اس کے بعد رسول اللہ کے اونٹ کے بال بٹ کر رفو کیا۔ اس لئے میری کیا مجال کہ میں اس لباس کو زیب تن کروں جس کو ایسی ایسی مقدس ہستیوں کی جلوہ گری کی سعادت نصیب ہوچکی ہے)

(۴)

خلیفہ مہدی کے زمانے میں ایک شخص نے دعوائے نبوت کیا۔ خلیفہ نے اسکو طلب کیا اور پوچھا کہ "تم اپنے ساتھ کوئی معجزہ بھی لائے ہو؟" اس نے جواب دیا کہ "بیشک میں معجزہ بھی لایا ہوں۔ اور جو چیز تم چاہو میں اسے مہیا کرسکتا ہوں"

خلیفہ نے کہا کہ "تم ایک تربوز مجھے دو۔ گو موسم اس کا نہیں ہے، لیکن نبی تو موسم کا پابند نہیں ہوسکتا۔"

اس نے تھوڑی دیر تامل کیا اور کہا کہ "مجھے تین دن کی مہلت دیجئے۔ اس کے بعد پیش کردوں گا۔"

خلیفہ نے کہا "یہ بات غلط ہے، میں تمہیں ایک گھنٹہ کی بھی مہلت نہیں دے سکتا"

اس نے کہا "کس قدر عجیب بات ہے کہ خدا قادر مطلق ہونے کے باوجود تین مہینے سے پہلے تربوز پیدا نہیں کرسکتا اور تم اس کے پیغمبر کو تین دن کی مہلت بھی نہیں دیتے !"

(۵)

ایک بار نصر الدین، سردار قبیلہ "کبود جامہ" سے سلطان تکش کسی بات پر اتنا برہم ہوگیا کہ اس نے جلاد کو حکم دیا کہ "ابھی جاکر نصر الدین کا سر کاٹ لاؤ۔" جلاد اس کے پاس گیا اور سلطان کا حکم سنا کر کہا کہ "جھکائیے گردن"

نصر الدین نے کہا کہ "فرمان سلطان سے مجھے مجال سرتابی نہیں، لیکن کیا حرج ہے اگر تم مجھے زندہ لے چلو اور سلطان کے آگے میرا سر قلم کردو۔" جلاد اس پر راضی نہ تھا، لیکن بہت منت وسماجت کے بعد اس نے نصر الدین کی یہ التجا مان لی اور اسے اپنے ساتھ دربار لے گیا۔ سلطان یہ دیکھ کر کہ جلاد نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی بہت برہم ہوا اور اس سے عدم تعمیل حکم کا سبب دریافت کیا لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا۔ نصر الدین دست بستہ آگے بڑھا اور یہ رباعی سنائی۔

من خاک تو در چشم خرد می آرم
عذرت نہ یکے نہ دہ کہ صد می آرم
سر خواستہٴ بدست کس نتواں داد
می آیم و برگردن خود می آرم

(آپ نے سر طلب کیا تھا سو میں خود اسے اپنی گردن پر لایا ہوں اور خود ہی پیش کرسکتا ہوں)

(۶)

ایک بار حضرت علی نے کسی بدوی عرب کو بہت جلدی جلدی ارکان نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ فارغ ہو تو آپ نے اس کو ڈانٹا اور کہا کہ نماز پھر ادا کرو اور عجلت سے کام نہ لو۔ جب وہ دوبارہ نماز پڑھ چکا تو آپ نے پوچھا کہ۔ "بتا تیری پہلی نماز بہتر تھی یا یہ"

اس نے جواب دیا کہ "پہلی کیونکہ وہ میں نے خدا کے ڈر سے پڑھی تھی اور یہ تمھارے ڈر سے۔!"

(جنگ ۔ کراچی)

# سیفو یونانی شاعرہ

(برہم ناتھ دت)

یونانی دیومالا میں مرقوم ہے کہ دیوتا زیوس کے ہاں نی موسائن کے بطن سے نو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ابتدا میں اُن کے لائحہ عمل وسعت کردار، اور
یالات میں بڑی یکسانی اور یک جہتی پائی جاتی تھی، وہ عیش و عشرت کی دلدادہ تھیں۔ وہ فکر و اندیشہ سے نا آشنا تھیں، اُن کے منظور نظر بندے دائمی مسرت
شادمانی سے ہمکنار رہتے تھے، غم دیدہ و غم زدہ اُن کی پناہ میں آکر غموں سے چھٹکارا پاتے تھے۔ مگر بعد کو ان میں سے ہر ایک کا دائرہ عمل الگ الگ
محدود ہو گیا، کالوپی رزمیہ شاعری کی دیوی بن گئی۔ کلی او، تاریخ کی، یوٹرپی نغموں کی، ملپومینو المیہ کی، ٹرپ سی کور، راگ رنگ کی، پولیا ہنوس،
رک شاعری اور فصیح البیانی کی، یورانیا علم ہیئت کی، تھالیا، قصیدۂ مکلف کی۔ اور اس کے ساتھ ہی محولہ بالا برکات اُن کے حد اختیار سے باہر ہو گئیں
پھر بھی ان کی پرستش و پرسش بدستور جاری رہی، فنون لطیفہ کی ان دیویوں کو "نو دیویوں" کے نام سے منسوب کیا جانے لگا۔ ۰۰ قبل مسیح، متی لینی
یونان) میں سومن ڈورنیس کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی، نابغۂ روزگار اور نجم الثاقب، جس کے پرتو سے سارا یونان جگمگا اٹھا اور جس کی ضو پاشیوں کے
اطراف نور ہی نور ہو گئے۔ والدین نے اس کا نام "سیفو" رکھا، زمانے نے بقائے دوام اور شاہ پرسٹرائس (۵۰۰ ق م) نے "ملک الشعراء" کا تاج
کے سر پر رکھ دیا، اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اُسے سر پر اٹھا لیا۔ افلاطون (۳۴۰ ق م) نے اس کی صلاحیتوں کے پیش نظر اسے "دسویں دیوی" کا نام
دیا، ارسطو (۳۸۴ ق م) نے اسے ہومر کی قطار میں مسند نشین کر دیا کاٹونس (۴۸ ق م) اور ہوریس (۴۶ ق م) نے اسے اپنا "معیار الفکر" بنا دیا
نس (۲۱۳) نے اُس کے "قصیدۂ انکٹوریا" کو الہام قرار دے دیا۔ اور کاٹوس نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے قصیدے کو لاطینی میں منتقل کر دیا
یہ ترجمہ اپنی جگہ ایک مستقل اور اہم چیز سمجھی جاتی ہے، مگر اہل بینش کی نظروں میں یہ ایک مبتدی کی ناکام مشقِ سخن سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی،
دنیا نے تسلیم کر لیا کہ "ہومر" اگر شاعر ہے تو "سیفو" لاریب "شاعرہ" ہے، یگانہ۔ بے مثل۔ لاثانی۔ نو کی نو دیویاں ماند پڑ گئیں اور فنون لطیفہ کے میدان
سیفو نے ان کی جگہ لے لی، ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود اس عقیدت اور عبودیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ مور (۱۷۷۹) نے اپنی کتاب "یونان کی
یں" میں اس کی شاعری پر اظہار خیالات کرتے ہوئے اسے بے مثل شاعر (شاعرہ نہیں) کہا ہے۔ لارڈ بائرن (۱۷۸۸) نے اپنی شہرہ آفاق نظم چائلڈ ہیرلڈ
سے متعلق وہ خود فخریہ کہتا ہے کہ میں خواب استراحت سے اٹھا تو دیکھا کہ میرے نام کے ڈنکے بج رہے تھے، کے پہلے بند کے پہلے شعر میں، سیفو کی فضیلت
اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

*The Isles of greece! The Isles of greece*
*Where burning Saffho loved & sung*

یعنی "جزائر یونان! جزائر یونان! جہاں شعلہ نوا سیفو نے محبت کی اور محبت کے گیت گائے۔ عجیب بات کہ اس نامور شاعر، عالی نسب و عالی
ذاب کو یونان کی عظمت کے اظہار میں نہ تو سقراط نظر آیا نہ سکندر، نہ دارجنیں گلبی نہ ارسطو، نہ افلاطون نہ اقلیدس، نہ فیثا غورس نہ ہومر اور نہ
کلس بلکہ اس کی نظر انتخاب سیفو کی دہلیز تک آکر رک گئی اور یونان بھر میں اس سے زیادہ جلیل القدر شخصیت اسے کوئی اور نظر نہ آئی۔ کہ یونان کے

نام محافظ خاندان کیساتھ وابستہ کرسکتا ہے (۱۹۲۱) ، سوائن برن اور کنگ (۰۰) ، اپنے سیفو کے بحر میں طبع آزمائی کرکے اس شاعرہ کی عظمت کو دو چار چاند
یئے ۔ اور سٹول کو پہنے تو عقیدت میں کہے ہوئے اپنے الفاظ کو موتیوں کا جالا بنا دیا ہے ۔ کہتا ہے ۔

سیفو کے منہ سے الفاظ گر تو لینے دو
انہیں کہیں پھینک دو ، پرندا اٹھے گا ، رنگینوں میں ڈھال لے گا ۔
کہیں دور اُجاڑ میں پھول کھلے گا
اور فضاؤں کو معطر و معنبر کردے گا

وہ متی لین کے ایک معزز اور ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئی ۔ اس کی ماں کا نام کلیسی تھا اور اس کے دو تین بھائی بھی تھے ، وہ کرکوس ایک رئیس سے بیاہی
مگر خاوند یا تو مرگیا یا اس سے علیحدگی اختیار کرلی ۔ ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی ۔ اس کا نام اپنی ماں کے نام پر اس نے کلیسی ہی رکھا ۔ وہ پلوٹکش اور الکلس دونوں
ادوں کی ہم عصر تھی ، ٹوس یورالکھتا ہے "کہ اس نے نظموں کے نو دیوان ، مجموعۂ لطائف ، مرثیے وغیرہ اپنے پیچھے چھوڑے اور قدما میں وہ بہت معزز
جاتی تھی" ۔

یونان ایک عظیم الشان ملک تھا ۔ تہذیب و تمدن کے نقوش یہیں سے ابھرے تحریک و ترقی کے سوتے یہیں سے پھوٹے ۔ روشنی اور اجالے کی
میں یہیں سے اٹھیں مگر جب "یونان و مصر و روما سب مٹ گئے" تو بلندیاں پستیوں میں تبدیل ہوگئیں ۔ حشمت مٹی میں مل گئی علم و ادب بھی اس کی
سے بچ سکا ۔ سیفو کا کلام بھی لٹ گیا اور برباد ہوگیا اور آج جو ہمارے سامنے ہے وہی ہے جو یا تو دوسرے شعرا کی بیاضوں سے اخذ کیا گیا ہے یا ان
ستاویز سے لیا گیا ہے جو برلن ، اکسفورڈ ، لندن کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں ۔

اس کی وفات کے دو سو سال بعد اس کی شاعری و ساحری ، حسن و زیبائی ، پاکیزگی اور دلربائی کے ساتھ ساتھ ایک جماعت ایسی بھی پیدا ہوگئی
نے اس کے مفروضہ تعشق کے چرچوں کو اچھالنا شروع کردیا اور اپنے ڈراموں کو مقبول بنانے کے لیے مبالغہ اور جھوٹ کی انتہا کردی یہاں تک کہ اس
وین دیوی ، کو بیسوا کے رنگ میں پیش کرنے لگے ۔ چھ استہزائی ڈرامے سیفو کے نام سے اور دو المیہ ڈرامے فعون کے نام سے منظر عام پر آگئے ، یہ سلسلہ
مدت سے جاری رہا یہاں تک کہ ۱۷۴۲ء میں ایک انگریز مصنف بل نے تو وہ گندگی اچھالی کہ توبہ ہی بھلی ۔ مگر جھوٹ کا پردہ فاش ہوکر رہا ۔ ۱۷۹۰ء
پروفیسر شیوبرٹ نے تحقیق کے بعد ان بہتان تراشیوں کو جھٹلا دیا اور اصل واقعات دنیا کے سامنے رکھ دیئے ۔ اور بعد کو ولکر نے ۱۸۱۶ء میں
قاطع سے ثابت کردیا کہ سیفو پاکیزگی اخلاق کا نمونہ تھی اور اس کا لڑکیوں کے مدرسۂ شاعری کا مدرس اعلیٰ ہونا ہی اس امر کا ناقابل تردید
ہے کہ اس کا چلن شک و شبہ سے بالاتر تھا ۔ اُس کا ہم عصر اور اس کے باپ کا قریبی دوست اُلیاس بھی اُس سے شادی کا تمنائی تھا اور اس نے
دلسوز الفاظ میں "نامۂ شوق" بھی لکھا جس کا اقتباس درج ذیل ہے ۔

اُس شعلہ بھبھوکا نے میرے پتے تک کو جلا دیا
اور وقت ، زمانہ ، سمندر اس آگ کو نہ بجھا سکے
میں نے تاروں کی سمت جھانکا ۔ تو تمہاری آنکھوں سے دوچار ہوا ۔
پھولوں پر نظر ڈالی تو تمہاری مسکراہٹوں نے گرویدہ بنا لیا
نم ناک آنکھوں سے دل کے اندر نظر ڈالی
تو اسی مندر میں تم کو جلوہ گر پایا
اے جلیل القدر سیفو ! لاثانی رحمانی دیوی

عقد و نکاح سے مجھے شادماں اور بامراد کر

سیفو کا جواب عشق و محبت کی داستان کا حرفِ آخر سمجھا جانا چاہئے، کتنا پاکیزہ، کتنا موثر اور لاجواب ہے کہتی ہے۔

السکاس محبت کے معنی سے ناآشنا ہے۔
اُن معنوں سے جو میرے دل میں پنہاں ہیں
ایک خوبصورت چہرہ۔ خوش نما سحر کن آنکھیں
نرم و نازک ہاتھ اُسے گم راہ کر دیتے ہیں
اور پھر اُس کے ذہن پر باسی پھولوں کی باس کی طرح چھائے رہتے ہیں
میں سچی، دائمی اور لازوال محبت کی متلاشی ہوں۔
جو میری پیٹھ کے کوزکو کبھی نگاہ میں نہ لاسکے
چاہے وہ کرۂ ارض جتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو، ایسی محبت جو اپنی نگاہوں ہی سے
چاہے میں پیرِ زال کی طرح کتنی ہی کریہ المنظر کیوں نہ ہوں
مجھ میں حسن کی دیوی کی سی ادائیں پیدا کرے
ایسی محبت جس کے شعلے کوہِ آتش فشاں کی طرح ہر وقت اٹھتے رہیں
ایسی محبت جس کی روشنی اور حدت سورج کی طرح گرمائی اور سرسرائی رہے
ایسی محبت جس کی دلسوزی میرے مہجور دل کا لنگر بن جائے۔

مگر ایسی پائدار محبت اس جہانِ فانی میں ناپید ہے۔ وہ کہاں سے آتی؟ وہ بھی اس سے محروم رہی اور بالآخر اُس نے ایک نوجوان "فعون" سے شادی کرلی۔ وہ بے وفا نکلا، اس کی لونڈی کو اغوا کرکے فرار ہوگیا۔ وہ پیچھے بھاگی مگر نامراد رہی اور آخر دل برداشتہ ہوکر بحیرۂ لیوکیڈیس کی غاروں میں چھلانگ لگا کر جان دیدی۔

اُس کی شاعری سے متعلق اُس کے دوستوں اور دشمنوں میں کوئی اختلاف نہیں، سب بیک زبان متفق الرائے ہیں کہ وہ اس فن میں "کامل" تھی۔ اس کی بحر جسے "سوفک سٹینزا" کہتے ہیں، تمام مغربی زبانوں میں مروج ہے مگر اس میں اُس کے علاوہ کوئی دوسرا وہ روانی اور خوبی نہ پیدا کر سکا جو اسے ودیعت ہوئی تھی، وہ دنیائے شاعری کی ایک ساحرہ ہے۔ شعر اُس کے گلہائے بے خزاں ہیں، جو رشکِ بہار بن کر "دامانِ باغباں اور کفِ گلفروش" ہوگئے۔ وہ مقلد نہیں موجد ہے، وہ راہ رو نہیں راہ نما ہے۔

اس کا کلام پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کردینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ سیفو کی جلوہ سامانیوں، معنی آفرینیوں اور نازک خیالیوں سے عہدہ برآ ہونا مترجم کے بس کا روگ نہیں اور مشکل اور بڑھ جاتی ہے جبکہ ترجمہ بھی ترجمہ در ترجمہ ہو، یونانی سے انگریزی اور پھر انگریزی سے اردو۔ ان حالات میں کلام کی اصلی روح کو قائم رکھنا معلوم، بہرکیف جو ہوسکا، حاضر ہے۔

**نارسائی**

میٹھے سیب کی مانند جو پیڑ کی بلند ترین شاخ پر نظر آرہا ہے۔
— انتہائی بلند مقام پر۔ جس کو مالی توڑنا بھول گیا!
بھول گیا؟ نہیں! اُسے اس تک رسائی ہی کہاں تھی؟

**دعا**

محبت کی لازوال دیوی! تاروں کی طرح جھلمل جھلمل کرنیوالے تخت کی والی!
دیوتاؤں کی منظورِ نظر! چھلے بہانے تراشنے والی! تیری منت کروں!

میرے دل کو مضطرب نہ کر۔ اذیت نہ پہنچا، پاؤں تلے نہ روند!

## گھر

جانِ مادر!
یہ نادرست ہے کہ گھر جو شعر و شاعری کا مسکن ہو،
گریہ و زاری وہاں قدم رکھے! تمہیں یہ زیب نہیں دیتا

## پھول

اُن پہاڑوں پر رگڈریا جن کا عاشق ہے، لہراتی سُنبل
زینتِ شباب! پاؤں تلے روندی گئی! سرنگوں!
ہائے وہ خوش نما پھول!

## دوست

اے دوست سر تو اٹھاؤ! آنکھیں تو ملاؤ!
اس راہ سے دل میں اتر آؤ اور میرے
تن بدن کو حسین بنا دو!

## تمنّا

ہماری فنا کے بعد ایسی سہانی رت بھی آئے
کہ ایک صدائے بازگشت بلند ہو اور دنیا پھر ہمارے گیتوں کو سنے

## عشق

یہ ڈالی ڈالی چہچہانے والا ایک پرند ہے۔
جو اپنی رمز آمیز راگنیوں سے دنیا کو مفتوں کئے ہوئے ہے۔
یہ ایک ہاتھ ہے کہ دل کی تاروں کو چھیڑے جا رہا ہے۔
کبھی محبت کے سُر لگاتا ہے اور کبھی وحشت ناک نفرت کے
یہ سانپ ہے جو قضا کے تیر چلاتا ہے۔ افعی ہے جو
مار ڈالتا ہے۔ اپنے زہر آلود نیش سے۔ برفانی کیڑا ہے۔
جو چھپ جاتا ہے۔ شیریں ترین پھل اور نفیس ترین پھول کے قلب میں
شعلہ ہے کہ ایک ہی لپک میں فنا کر دیتا ہے
آگ ہے کہ دہکنے سے اور بھڑکتی ہے۔
اور اپنے خونخوار دانتوں سے چبا کر برزخ میں ڈھکیل دیتی ہے۔
عشق امن و چین ہے، جنگ و جدل ہے، بقا و حیات ہے، فنا و موت ہے
بہشت و شادمانی ہے۔ دوزخ و کرب ہے۔
تو نے دیکھا، آن واحد میں، اس نے میری سانسیں اکھیڑ دیں۔
ٹھہرو اور دیکھو! کہ وہ کس طرح دھکیل کر مجھے موت سے ہم آغوش کر دیگا

## شام

بچے ماں کی گود میں آ بیٹھتے ہیں، بھیڑیں گڈریے کی پناہ میں
عرش تک پہنچنے والا باز، پرواز ہلکی کر کے بستیوں کی طرف مڑتا ہے
سب چیزیں جنہیں سورج نے اپنی سنہری انگلی سے بکھیر دیا تھا۔

اے شام! تو انہیں بالآخر اپنے اپنے ٹھکانے لا بٹھاتی ہے!

**انجام عشق**

ابدی دیوتاؤں کی طرح وہ جوان مبارک ہے
جو تیرے قدموں میں شوق اور اشتیاق سے بیٹھتا
ہر لحہ تیری باتیں سنتا اور تجھے اپنی آنکھوں دیکھتا ہے
میٹھی میٹھی باتیں کرتا اور مسکراہٹوں کے پھول برساتا ہے
اتنی سی بات نے میری روح کو راحت و آرام سے محروم کر دیا
اور میرے سینے میں ایک ناقابل بیان شورش پیدا کر دی
جب میں نے ایک نظر ڈالی تو اس کی نگاہ کے طلسم نے
میری سانسیں اکھیڑ دیں اور میری قوت گویائی جاتی رہی
میرا سینہ دہکنے لگا، ایک نازک مرمل لطیف شعلہ
بجلی کی طرح میری نس نس میں دوڑ گیا
میری بے نور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا
میرے کانوں میں سنسناہٹ آ گئی
اوس میں بھیگی ہوئی رطوبت سے میرا بند بند ٹھٹھر اٹھا
میرا جسم ہوش ربا دہشت سے کانپ اٹھا
میری نبض کی کم زور ضربیں بالکل ساکت ہو گئیں
مجھے غش آ گیا، گر پڑی اور پھر نہ اٹھ سکی۔

**ھولناک چھلانگ**

موسمِ بہار میں یہ بھی ہوتا ہے کہ شفاف پانی کی تہہ میں
ریت چاندی کی طرح سفید نظر آتی ہے۔
بہار ایسی بھی آتی ہے کہ اُس کے صیقل سے
کنول گلزار کے خوب صورت شگوفہ کی طرح کھلتا ہے
جب میں رو رہی تھی تو ایک شبیہہ پانی سے اٹھی
میرے سامنے آئی اور گویا ہوئی۔
"سیفو محبت کی دیوانی، غم تیرا دیوانہ ہے۔
سیفو اینیلے بحرِ لیوکیڈیہ کے کنارے
ایک چٹان ہے۔ اُس کی غاروں میں
(جن کی گونج آپالو کے مندر اور نیلے سمندر کی
بڑھتی ہوئی موجوں تک جا پہنچتی ہے)
عشاق کو خواب استراحت نصیب ہو جاتا ہے اور محبت کے دیوانوں کو تسکین مل جاتی ہے۔

دیوکیلیس، کی فلس، فوبس، کو محبت کے درد کا درمان یہیں میسر آیا۔
سیفو! اٹھ! جس جگہ پہاڑوں کی بلندیاں ڈھلوان میں آتی ہیں۔
تو اپنا وجود، کاش کہ پیدا ہی نہ ہوتا وہاں سے
لہروں کے حوالے کر دے، ان نیلی نیلی لہروں کے جو تیرے انتظار میں ہیں"
میں اٹھتی ہوں تعمیل ارشاد میں، ادھر چل پڑتی ہوں
ڈرتی ہوں مگر ڈر سے زیادہ ڈراؤنی محبت ہے
اس محبت سے تو ویرانی اور خوف کہیں بہتر!
آہ نفرت سے تو نیلی لہریں بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہیں!
اے موافق ہواؤ! میری رکھوالی کرنا!
اے عشق کے دیوتا کیوپڈ! اپنے پر مستعار دے ڈال کہ میں سمندر کو پار کر لوں
اور اے سورج دیوتا تیرے مندر میں
اس نظم کے ساتھ! میں اپنا رباب بھی پھینک دوں گی
سیفو اپنا رباب سورج دیوتا کی نذر کرتی ہے!
یہ تحفہ دیوتا کے لئے! مال عرب پیش عرب

—— ۲ ——

تف ہے مجھ پر!
کیا سورج دیوتا کے آستانہ پہ مجھے جانا واجب ہے"
یعنی! یہ دیوتا میری نگاہ میں کیا وقعت رکھتا ہے۔
کیا تو مجھے اس چاہ ذلت میں گرنے دے گا؟
یہ ٹوٹی پھوٹی ناتراشیدہ چٹانیں میرے سینے کی دھجیاں بکھیر دیں گی
اس تباہ و برباد سینے کی جس نے تجھے پیار کیا!
آہ وہ نغمہ جس کو موسیقی نے خود جنم دیا تھا
میرا ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ میرا سرود اب ٹوٹ چکا ہے۔
میرا کوئی یار و مددگار نہیں رہا۔
اس تاریکی میں تاروں کی چمک بھی پھیکی پڑ گئی ہے
الوداع! یونان کی لڑکیو! الوداع
جب مری زبان بند ہو جائے گی تو یہ کنج میرے نغموں سے کیونکر گونجیں گے؟
اور یہ ہاتھ حیات آور عشق کے دل کش سُر چھیڑنے کے لئے کس طرح اٹھیں گے!

— ۳ —

آہ! وہ فرار ہو گیا!
آسودگی اور شادمانی واپس آجا!
ایک بار میری روح کو پہلی سی الاپ لینے دے۔
ایک بار اسی جاں بخش نور سے میرے سینے کو منور کر دے
دریغ تا! میری کوئی دعا قبول نہ ہوگی؟
کیا میرا کوئی گیت بھی واپس نہیں لا سکتا اس گم گشتہ کو؟
کیا میری کوئی آہ، میری کوئی التجا نہیں بلا سکتی، اس گم راہ کو؟
میری جان! میری روح! میری کائنات
آجا! آجا!
اپنے بادباں ہوا میں بلند کر دے!
وقت کے پاٹ کو سمیٹ دے۔ میرے لئے اُسے واپس لے آ،
ایروس (محبت کی دیوی) ہواؤں کو تیرے لئے ساز گار کر دے گی
ایفروڈائٹ (محبت کی دیوی کا دوسرا نام) کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے
آسماں جس جگہ نفاق ڈالنے والے بادلوں کو تتر بتر کر دیتا ہے
اُسی افق سے اپنا سفید بادباں بلند کر
اگر تیرا بادباں بلند نہ ہوا تو ان نیلی نیلی گہرائیوں پر
(جنہیں ڈیوکیلن نے پناہ گاہ بنایا تھا) اسی طرح تاریکیاں چھائی رہیں گی
اگر تیرا سفید بادبان بلند نہ ہوا تو یہ خوفناک موجیں
مجھے موت سے ہم آغوش کر دیں گی یا خود فراموشی ہی میرا انجام ہوگا

یہ کچھ لکھ چکنے کے بعد صرف شیکسپیئر کا ایک شعر جس کا اطلاق سیفو پر پورا پورا ہوتا ہے پیش کرنا باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے۔

میں نور و نسیم ہوں، اپنے دوسرے عناصر
سونپ دیتی ہوں۔ فطرتِ ادنیٰ کو۔


# اقبال نمبر

(سالنامہ ۱۹۶۲ء) جسے پاکستان کے معجز بیان شاعر اقبال کے نام نامی پر موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار۔ شاعری کی ابتدا، اور مختلف ادوار شاعری، اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت :- تین روپے

# حافظ کا معشوق

## اشعار حافظ کا ایک نئے زاویے سے مطالعہ

پروفیسر سید حسن

خواجہ حافظ شیرازی کی شہرت کا سبب ان کا وہ کلام ہے جو سراسر عشق و محبت کے والہانہ جذبات واحساسات سے لبریز اور شیفتگی و وارفتگی کے مطالب سے مملو ہے۔ لوگ ان کی محبت کو عشق حقیقی سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے اشعار کو حقیقت و عرفان کا آئینہ سمجھتے ہیں لیکن جذبات عشق اور معاملات محبت جس وضاحت و صداقت سے حافظ کے اشعار میں بیان ہوئے ہیں اُس سے گمان غالب ہوتا ہے کہ یہ عشق حقیقی محبت مجازی کی منزل سے ضرور گزری ہے۔

صوفیہ نے جوانی میں ماہرویوں سے محبت کی ہے اور اس محبت کو اپنی پاکبازی و روحانیت، سرمستی و سرشاری اور صدق و صفا کے ذریعے عشق حقیقی کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ جوانی میں کون ایسا دل ہے جو محبت کی لذت سے محروم رہا ہے۔ اس لئے خواجہ حافظ کا کسی پری رو سے دل لگانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ پھر حافظ کا مولد و موطن ایک ایسا شہر تھا جس کا حسن شہرۂ آفاق رہا ہے۔ خود حافظ نے اپنے شہر کی خصوصیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

شیراز معدن لب لعلست و کان حسن
من جوہری مفلسم ازاں مشوشم
شہریست پر کرشمۂ خوباں ز شش جہت
چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم

ترکان شیرازی، لولیان شوخ و شیریں کا اور شاہدان طناز کے کمند گیسو میں حافظ ایسے حسن پرست کا دل کیونکر نہ گرفتار ہوتا۔ انھوں نے اپنی دلبازی و رندی کا کھلم کھلا اعلان کیا ہے۔

من دوستدار روی خوش و موی دلکشم
مدہوش چشم مست و می صاف بیغشم

حافظ کے اشعار شاہد ہیں کہ انھوں نے شیراز کے غزالان زیبا سے محبت کی ہے۔ اور انھیں اپنی غزلوں کا مخاطب تمناؤں کا کعبہ اور ارمانوں کا مرجع بنا یا تھا۔ ان کے معشوق دنیا بھر کے معشوقوں کی طرح شوخ و شنگ، کرشمہ ساز، غمزہ طراز، عربدہ جو، تغافل کیش، بے وفا، سنگ دل، عہد شکن، عاشق کش اور ناز آفریں تھے۔ جس کی وجہ سے حافظ کو چشم نمناک،

اشک خونیں، آہ آتشبار، سینہ بریاں، قلب سوزاں، گریۂ سحری، نیاز نیم شبی، اضطراب پیہم، درد فراق، حسرت وصل اذیت رقیب، ملامت ناصح، غرض عشق بازی کی تمام حالتوں اور کیفیتوں سے واسطہ پڑا۔ انھوں نے اپنے غم عشق کا مداوا مے نوشی میں ڈھونڈا اور درد کا درماں سرمستی کو بنایا۔

حافظ کے معاشقہ کے بارے میں مختلف داستانیں مشہور ہیں، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ "دردانہ" نامی ایک چاردہ سالہ دوشیزہ پر عاشق تھے اور اس کے ثبوت میں یہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

عشق دردانہ است و من غواص و دریا میکدہ
سر فرو بردم در آنجا تا کجا سر بر کنم

وہ کہ دردانہ چنیں نازک در شب تار سفتنم ہوس است

جاں بشکرانہ کنم صرف گراں "دانہ در"
صدف دیدۂ حافظ شود آرا مگہش

حافظ کی ایک غزل ہے جس کی ردیف "فرخ" ہے روایت مشہور ہے کہ فرخ، حافظ کی ایک محبوبہ کا نام تھا اور یہ غزل اسی کے نام پر لکھی گئی ہے۔

دل من در ہوای روی فرخ بود آشفتہ ہمچوں موی فرخ
شود چوں بید لرزاں سرو آزاد اگر بیند قد دلجوی فرخ
بدہ ساقی شراب ارغوانی بیاد نرگس جادوی فرخ
اگر میل دل ہر کس بجای است بود میل دل من سوی فرخ

غلام ہمت آنم کہ باشد
چو حافظ بندہ دہندوی فرخ

لیکن جس قصے کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ شاخ نبات کا افسانہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاخ نبات ایک نوجوان عورت تھی جو حافظ کی منظور نظر بن گئی تھی۔ چونکہ حافظ فقیر و درویش تھے۔ وصل کی کوئی صورت میسر نہ آتی تھی۔ انھوں نے منت مانی اور مزار باباکوہی پر جاکر چلہ کشی کی۔ چوتھی رات کو نماز و نیاز کے بعد نیند آئی تھی کہ خواب میں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کے دیدار سے مشرف ہوئے جنھوں نے خزائن غیب کے دروازے ان کے قلب پر کھول دیئے اور علم و عرفان کی دولت عطا کی۔ جب حافظ خواب سے بیدار ہوئے تو اپنے کو شاعر و عارف پایا۔ اور وہ مشہور غزل لکھی جسکا مطلع یہ ہے

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

دردانہ۔ فرخ یا شاخ نبات کا کوئی وجود تھا یا نہیں وثوق کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ حافظ کے کسی ہمعصر مورخ یا سوانح نگار نے ان معشوقوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ البتہ بعد کے شارحین کلام حافظ اور تذکرہ نویسوں نے ان کے اشعار سے یہ نام اخذ کر کے داستانیں ایجاد کرلی ہیں۔ درحقیقت حافظ کے کلام میں بہت سے ایسے اشارے اور کنائے ملتے ہیں جن کی بنا پر اس قسم کی خیال آرائی کی خاصی گنجائش ہے۔ بلکہ حافظ کے معشوقوں کی فہرست ان ہی تین ناموں تک محدود نہیں ہے۔

اس میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اور ممتاز نام شیراز کے شہزادہ شاہ شجاع کا ہے جس سے حافظ نے زور و شور کے ساتھ محبت کی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ بات شاید بے بنیاد اور غیر متوقع معلوم ہو لیکن اگر ہم حافظ کے اشعار کا ان کے عہد کی تاریخ کی روشنی میں غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کریں تو اس قیاس آرائی کے لئے نہایت واضح اور ناقابلِ تردید اسباب فراہم ہو جاتے ہیں۔

شاہ شجاع یزد کے حاکم امیر مبارز الدین کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کی ولادت یزد میں ۷۳۳ھ میں ہوئی تھی۔ وہ نہایت حسین و جمیل تھا۔ اس کے حسن و جمال کا تذکرہ اس عہد کی سب تاریخی کتابوں میں موجود ہے۔ اس زمانے کے علمائے یزد میں مولانا معین الدین یزدی بھی تھے جو اپنے شہر میں علوم عقلی و نقلی کی تدریس و تعلیم میں اپنے اوقات عزیز صرف کرتے تھے۔ ان کے حلقۂ درس و افاضت میں شہزادہ شجاع بچپن ہی سے بڑی عقیدت و اخلاص کے ساتھ شریک ہو کر علوم دینیہ اور کمالات انسانیہ حاصل کرتا تھا۔ شاہ شجاع کی فرمائش و استدعا پر مولانا معلّم یزدی نے خاندان مظفری کی ایک مستند تاریخ لکھی جس کا نام مواہب الٰہی ہے جو تقریباً ۷۶۷ھ میں مکمل ہوئی اس کتاب میں امیر مبارز الدین اور شاہ شجاع کے حالات زندگی اور کارنامے شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں۔ شاہ شجاع کی ولادت کا حال لکھتے ہوئے معلم یزدی نے شہزادہ کے حسن و جمال کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"آفتابی بود کہ چوں برآمد در ہر زاویہ تحفۂ نور فرستاد ماہی بود کہ چوں از مطلع سر بر زد
ظلمت اندوہ منقشع گشت" (مواہب الٰہی ص۹۴ چاپ تہران)

دوسری جگہ شہزادہ کو "ماہ نو سپہر بادشاہی" کہا ہے۔ ایک اور موقع پر جب امیر مبارز الدین مظفر نے اوغانی اور جرمائی قبیلوں کا قلع قمع کرنے کے لئے فوج کشی کی تو شہزادہ شجاع ہم رکاب ہو گیا۔ اس وقت شہزادہ کا سن سولہ سال تھا۔ معلم یزدی نے شاہزادہ کی شجاعت اور حسن کا ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

"سرولیست در چمن دلاوری بالا کشیدہ سرسبزی آب تیغ و ہوائی معرکہ داند۔ آفتابیست
کہ از مطلع بسالت در پردلی آمدہ بلندی از تیغ آزمائی و جہانگیری شناسد۔"
(مواہب الٰہی ص۲۰۱)

نامور مورخ عبد الرزاق سمرقندی نے بھی اپنی کتاب مطلع السعدین میں شہزادہ شجاع کی خوبصورتی کا حال لکھا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"شاہ شجاع روی خوب و منظری محبوب و شمائل مرغوب داشت و فضلائی زمان از انوار
او اقتباس می نمودند و در میدان شجاعت رستم دستان و اسفندیار دوراں بود۔"

۷۵۴ھ میں امیر مبارز الدین مظفر نے شیراز کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اسی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ حافظ نے غالباً پہلی بار شہزادہ کو یہیں دیکھا۔ حسن پرست اور عشق پیشہ حافظ حسین و خوبصورت شہزادے کو دیکھتے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ اس وقت خواجہ حافظ کا سن تقریباً ۲۷ برس تھا اور شاہزادہ کی عمر ۲۱ سال تھی۔ حافظ نے اسے اپنی غزلوں کا موضوع بنا لیا اور رمز و کنایہ میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کرنے لگے۔ اس وقت تک خواجہ حافظ دربار سلطانی سے متوسل نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ شروع میں شاہ شیخ ابو اسحٰق اینجو فرمانروائے شیراز کے دربار سے وابستہ تھے اور شاہ اسحٰق امیر مبارز الدین

مظفر کے دشمنوں میں تھا۔ اس کے علاوہ امیر مظفر بہت تند خو اور درشت گو بادشاہ تھا۔ شیراز پر تسلط حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی سلطنت میں تمام شراب خانوں کو بند کرا دیا اور سخت احتساب، جاری کر رکھا تھا۔ حافظ کی آزاد طبیعت اس کی تند خوئی اور سخت گیری کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے دربار شاہی سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ حافظ نے کئی غزلوں میں امیر مبارز الدین کی سخت گیری پر تنقید کی ہے۔

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند پنہاں خورید بادہ کہ تعزیر می کنند
گویند رمز عشق مگوئید و مشنوید مشکل حکایتی است کہ تقریر می کنند

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است
ببانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است
بآب دیدہ بشوئیم خرقہ ہا از می
کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است

بود آیا کہ در میکدہ ہا بگشایند گرہ از کار فروبستۂ ما بگشایند

تاریخ کی کتابوں میں ایک اور واقعہ مرقوم ہے جس سے شاہ شجاع کی خوبصورتی کی تصدیق ہوتی ہے۔ امیر مبارز الدین کو منجموں نے یہ خبر دیتی کہ اسے ایک بلند قامت نوجوان ترک سے ملال و صدمہ پہنچے گا۔ وہ ہمیشہ سلطان اویس جلائر بن امیر شیخ حسن بزرگ ایلکانی فرمانروائے عراق سے خائف رہتا تھا کیونکہ اس کی نگاہ میں یہ نوجوان بادشاہ منجموں کے بتائے ہوئے اوصاف کا حامل تھا لیکن امیر مظفر کو اپنے بڑے بیٹے شاہ شجاع کا خیال نہ آیا حالانکہ یہی شہزادہ بقول مؤلف "حبیب السیر" بحد کامل ترایں صفات را واجد بود یعنی جوانی بود ترک نژاد و بلند و بالا و خوش سیما" امیر مبارز الدین کے آخر عمر میں منجموں کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ اس نے اپنے دو بیٹوں شاہ شجاع اور شاہ محمود سے کسی بات پر ناراض ہو کر ان کو اندھا کر دینے کی دھمکی دی۔ خوفزدہ ہو کر دونوں شہزادوں نے سازش کی اور باپ کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر اسے اندھا کر دیا۔

شیراز کی زمام حکومت اب شاہ شجاع نے سنبھال لی۔ وہ آزاد منش اور خوش مشرب شخص تھا۔ اس نے میکدوں سے پابندیاں اٹھا دیں اور غیر متعصبانہ رویہ اختیار کیا۔ خود صاحب ذوق شاعر تھا، شاعروں اور ادیبوں کی پرورش اور قدر افزائی کرتا تھا۔ خواجہ حافظ نے بھی دربار میں رسائی حاصل کر لی اور شاہ شجاع سے دوستی اور تقرب پیدا کیا۔ شاہ شجاع ۷۵۹ھ میں تخت نشین ہوا اور اس کی وفات ۷۸۶ھ میں ہوئی اس طرح خواجہ حافظ اور شاہ شجاع کی دوستی و آشنائی تقریباً ۳۲ برس تک قائم رہی۔ اس مدت میں حافظ نے بیسیوں غزلیں لکھیں جن کا مخاطب شاہ شجاع ہے۔ ایسی غزلیں تین طرح کی ہیں ایک تو وہ جن میں صراحتہً شجاع کا نام یا اس کا لقب "ابوالفوارس" استعمال کیا ہے۔ دوسری وہ جن میں اس کو صرف بادشاہ، سلطان، خسرو، شہنشہ، پادشہ، شہریار۔ شاہ۔ شاہ عالم۔ جمشید کامگار۔ ملک فرمان دہ۔ دادگر کے خطابات سے یاد کیا ہے۔ ان دونوں قسموں کی مدحیہ غزلوں میں حافظ شجاع کے لئے وہ تمام آداب احترام ملحوظ رکھتے ہیں جو ایک درباری شاعر کے لئے لازمی ہیں نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش کہ دور شاہ شجاع است می دلیر بنوش

محل نور تجلی است رای انور شاہ چو قرب او طلبی در صفائی نیت کوش

ستارہ بدرخشید و ماہ مجلس شد
دل رمیدہ ما را انیس و مونس شد
خیال آب خضر بست و جام کیخسرو
بجرعہ نوشی سلطان ابو الفوارس شد

در عہد پادشاہ خطا بخش و جرم پوش
حافظ قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش
ای پادشاہ صورت و معنی کہ مثل تو
نادیدہ ہیچ دیدہ و نشنیدہ ہیچ گوش

تیسری قسم کی غزلیں وہ ہیں جو سرتاسر عاشقانہ ہیں اور جن میں حافظ نے شاہ شجاع کو ایسے القاب سے یاد کیا ہے جو صرف معشوق کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ القاب بھی چار قسم کے ہیں۔

اول وہ جو عشقیہ شاعری میں عام طور پر مستعمل ہیں۔ دلبر۔ دلآرام یار۔ ماہ۔ صنم۔ جان۔ نگار دلدار۔ آفتاب خوباں۔ زہرہ جبین نازنین۔ دوست۔ بت وغیرہ۔

دوم معشوق کے بادشاہ ہونے کے لحاظ سے۔ شاہ خوباں۔ شاہ حسن۔ شاہ ترکاں، شاہ وش۔ مہ صاحبقراں۔ سلطان خوباں

سوم معشوق کے ترک نژاد ہونے کے اعتبار سے۔ ترک۔ ترک شیرازی۔ شاہ ترکان ترک عاشق کش۔ ترک پریچہرہ۔

چہارم معشوق کے سرو قامت ہونے کے لحاظ سے (تاریخ کی کتابوں میں جہاں شاہ شجاع کے حسن کی توصیف کی گئی ہے۔ اس کے سرو قد ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے) سرو بلند۔ سرو سہی۔ سرو چمان، سرو خراماں۔ سرو قامت۔ بالا بلند۔

بعض شعروں میں حافظ اپنے ممدوح اور محبوب کا تذکرہ ایک ساتھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ وہ لوگ بھی جو ان کے راز عشق سے واقف نہیں ہیں سمجھ جائیں کہ دونوں ایک ہیں۔

اگرچہ حسن فروشان بجلوہ آمدہ اند
کسی بحسن و ملاحت ہیار ما نرسد
ای مہ صاحبقراں از بندہ حافظ یاد کن
تا دعامی دولت آں حسن روز افزوں کنم

حافظ کو شاہ شجاع سے اس قدر قلبی لگاؤ تھا کہ وہ اپنے محبوب و ممدوح کی جدائی ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خود اس حالت کو ذیل کے شعر میں بیان کرتے ہیں۔

آندم کہ با تو باشم یک سال ہست روزے
آندم کہ بی تو باشم یک لحظہ ہست سالے

۷۶۵ھ میں بادشاہ اور اس کے بھائی شاہ محمود کے درمیان سلطنت موروثی کی تقسیم کے لئے جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں شاہ شجاع کے بعض ساتھی اور رشتہ دار اس کو دغا دے کر شاہ محمود سے مل گئے۔ مہینوں تک لڑائی ہوتی رہی،

آخر میں شاہ شجاع کو شکست ہوگئی اور اسے مجبوراً شیراز چھوڑ کر کرمان میں پناہ لینا پڑی۔ شیراز پر شاہ محمود کا تسلط ہوگیا۔ شاہ شجاع تقریباً دو سال تک شیراز سے باہر رہا۔ شاہ محمود کا دور حکومت یوں تو عام شیرازیوں کے لئے سخت گذرا کیونکہ شاہ محمود نالائق اور ظالم بادشاہ تھا۔ لیکن حافظ کے لئے اپنے محبوب سے جدائی کا یہ زمانہ بڑا صبر آزما اور حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ اس زمانے میں حافظ نے بڑی پر تاثیر غزلیں لکھی ہیں جن میں انھوں نے غم فرقت کی تمام کیفیتوں کو بڑے دردناک لہجے میں بیان کیا ہے۔ ذیل کے اشعار ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

غم محبوب سے جدائی کا ملال۔

آں ترک پری چہرہ کہ دوش از بر ما رفت — آیا چہ خطا دید کہ از راہ خطا رفت

تا رفت مرا از نظراں چشم جہاں بین — کس واقف ما نیست کہ از دیدہ چہا رفت

دور از رخ تو دمبدم از گوشۂ چشم — سیلاب سرشک آمد و طوفاں بلا رفت

شربتی از لب لعلش نہ چشیدم و برفت — روی مہ پیکر او سیر ندیدم و برفت

شد چماں در چمن حسن و لطافت لیکن — در گلستان وصالش نہ چمیدم و برفت

ہمچو حافظ ہمہ شب نالہ و زاری کردیم
کای دریغا بوداعش نرسیدیم و برفت

محبوب کو پیغام محبت اور دعا و ثنا کے نذرانے بھیجتے ہیں۔

ہد ہد صبا بسبا می فرستمت — بنگر کہ از کجا بہ کجا می فرستمت

ای غائب از نظر کہ شدی ہم نشیں دل — می گویمت دعا و ثنا می فرستمت

تا مطرباں ز شوق منت آگہی دہند — قول و غزل بساز و نوا می فرستمت

لیکن شاہ شجاع کو سیاسی جوڑ توڑ اور جنگ و جدل سے اتنی مہلت کہاں ملتی تھی کہ وہ حافظ کے پیغام محبت کا جواب دیتا۔ حافظ دل شکستہ ہوکر اپنی محرومی کا گلہ کرتے ہیں۔

دیر ست کہ دلدار پیامی نفرستاد — ننوشت سلامی و کلامی نفرستاد

صد نامہ فرستادم و آں شاہ سواران — پیکی ندوانید و سلامی نفرستاد

حافظ بہ ادب باش کہ واخواست نباشد — گر شاہ پیامی بغلامی نفرستاد

مایوسی اور بیچارگی کے عالم میں حافظ بار بار صبا سے التجا کرتے ہیں کہ وہ دوست کی خبر لائے اور ان کا حال جا کر دلدار کو سنائے۔

صبا اگر گذری افتدت بہ کشور دوست
بیار نفحۂ از گیسوی معنبر دوست
بجان او کہ بشکرانہ جاں بر افشانم
اگر بسوی من آری پیامی از بر دوست
من گدا و تمنای وصل او ہیہات
مگر بخواب بہ بینم خیال منظر دوست

مرحبا ای پیک مشتاقاں بدہ پیغام دوست
تاکنم جاں از سرِ رغبت فدای نام دوست

ای صبا نکہتی از کوی فلانی بمن آر
زار و بیمار غمم راحت جانی بمن آر

ای صبا نکہتی از خاک رہ یار بیار
ببراندوہ دل و مژدۂ دلدار بیار

روزگاریست کہ دل چہرۂ مقصود ندید
ساقیا آں قدح آئینہ کردار بیار

ای پیک راستاں خبر یار ما بگو | احوال گل بہ بلبل دستاں سرا بگو
گر دیگرت بر آں در دولت گذر بود | بعد از ادای خدمت و عرض دعا بگو
بر ایں فقیر نامہ آں محتشم بخواں | با ایں گدا حکایت آں پادشا بگو

محبوب کی جدائی میں آہ و نالہ اور فریاد و گلہ کے ساتھ حافظ اس کی صحت و سلامتی اور اس کے حسن کی ترقی کی دعائیں بھی کرتے تھے۔

تنت بناز طبیباں نیاز مند مباد | وجود نازکت آزردہ گزند مباد
جمالت آفتاب ہر نظر باد | زخوبی روی خوبت خوبتر باد
بجاں مشتاق روی تست حافظ | ترا در حال مشتاقاں نظر باد

حافظ بادشاہ کے واپس آنے کی تمنا کرتے اور دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔

زہی خجستہ زمانی کہ یار باز آید | بکام غمزدگاں غمگسار باز آید
مقیم بر سر راہش نشستہ ام چوں گرد | بداں ہوس کہ بدیں رہگذار باز آید
یارب آں آہوی مشکیں بختن باز رساں | واں سہی سرو خراماں بچمن باز رساں
دل آزردۂ ما را بہ نسیمی بنواز | یعنی آں جان ز تن رفتہ بتن باز رساں
سخن اینست کہ ما بی تو نخواہیم حیات | بشنو ای پیک خبر گیر و سخن باز رساں
آنکہ بودی وطنش دیدۂ حافظ یارب | بمرادش ز غریبی بوطن باز رساں

حافظ کی تمناؤں اور پرخلوص دعاؤں کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے ایک رات خواب دیکھا کہ

دیدم بخواب دوش کہ ماہی بر آمدی | کز عکس روی او شب ہجراں سر آمدی
تعبیر رفت کہ یار سفر کردہ می رسد | ای کاش ۔ چہ زود تر از در در آمدی
ذکرش بخیر ساقی فرخندہ فال من | کز در مدام با قدح و ساغر آمدی

حافظ فطرۃً خوش بین و متفاؤل ہیں وہ پر امید ہیں کہ ان کا محبوب جلد اپنے وطن کو لوٹ آئے گا۔ ایام ہجر میں وہ اسی امید پر زندگی گذارتے ہیں کہ

نفس باد صبا مشک فشاں خواہد شد | عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

ایں نظاول کہ کشید از غم ہجراں بلبل

تا سراپردۂ گل نعرہ زناں خواہد شد

رسیدم مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند — چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

حافظ مکن اندیشہ کہ آں یوسف مصری — بازآید و از کلبۂ احزاں بدر آئی

آخر مہینوں کی آہ وزاری، نالہ و فریاد، پیام و سلام، تنہائی و گوشہ گیری، دعا و تمنا اور بے قراری و امیدواری کے بعد غم ہجراں کا دور ختم ہوا اور وصل کی ساعت آپہنچی۔ دو سال کی ناکامی و آوارہ گردی کے بعد شاہ شجاع نے پھر شیراز پر چڑھائی کر کے ۷۶۷ ہجری میں اسے فتح کر لیا اور تخت شاہی پر دوبارہ متمکن ہوا۔ اس موقع پر عام شہریوں کو خوشی ہوئی لیکن حافظ کی مسرت و شادمانی کی کوئی حد نہ تھی۔ انھوں نے اپنے محبوب بادشاہ کی کامیابی و بازگشت کے متعلق بڑی ولولہ انگیز غزلیں لکھی ہیں جو کہ جوش مسرت اور مژدہ تہنیت سے لبریز ہیں۔

روز ہجراں و شب فرقت یار آخر شد — زدم ایں فال و گذشت اختر و کار آخر شد

آں ہمہ ناز و تنعم کہ خزاں می فرمود — عاقبت در قدم باد بہار آخر شد

شکر ایزد کہ باقبال کلہ گوشۂ گل — نخوت باد دی و شوکت خار آخر شد

آں پریشانی شبہای دراز و غم دل — ہمہ در سایۂ گیسوی نگار آخر شد

سحرم دولت بیدار ببالیں آمد — گفت برخیز کہ آں خسرو شیریں آمد

قدحی درکش و سرخوش بتماشا بخرام — تا ببینی کہ نگارت بچہ آئین آمد

ایک اور موقع پر حافظ بادشاہ کی جدائی سے اسی قسم کی حالت و کیفیت میں مبتلا ہوئے تھے۔ ۷۷۰–۷۶۹ھ میں شاہ شجاع اپنی بیٹی کی ملاقات کو یزد گیا جہاں اس کا داماد اور بھتیجا شاہ یحییٰ اس کی طرف سے حاکم تھا۔ شاہ شجاع وہاں چند دنوں تک اقامت پذیر رہا۔ اس موقع پر بھی حافظ اس کی فرقت میں بہت بیقرار ہوئے۔ ان کے اشعار سے ان کی بیقراری کا پتہ چلتا ہے۔ وہ بادشاہ کو بار بار "یار سفر کردہ" کے لقب سے یاد کر کے اپنے اندوہ و فراق اور غم جدائی کو بیان کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بادشاہ صرف ایک ہفتہ یزد میں رہا لیکن یہ قلیل مدت بھی حافظ کو بڑی شاق گذری۔

ماہم ایں ہفتہ برون رفت و بچشمم سالیست

حال ہجراں تو چہ دانی کہ چہ مشکل حالیست

کوہ اندوہ فراقت بچہ حالت بکشد

حافظ خستہ کہ از نالہ تنش چوں نالیست

حافظ کو اس بات کا ملال ہے کہ بادشاہ نے سفر کرتے وقت اس کو خبر نہ دی۔

دلبر برفت و دلشدگاں را خبر نکرد — یاد حریف شہر و رفیق سفر نکرد

بادشاہ کی جدائی میں حافظ کا حال۔

دوش آگہی ز یار سفر کردہ داد باد — من نیز بباد دہم ہر چہ باد اباد

خون شد دلم بیاد تو ہر گہ کہ در چمن    بندِ قبای غنچۂ گل میکشاد باد

بادشاہ کی سلامتی کے لئے دُعائیں۔

ای غائب از نظر بخدا می سپارمت    جانم بسوختی و بدل دوست دارمت

تا دامن کفن نکشم زیر پای خاک    باور مکن کہ دست ز دامن بدارمت

آن سفر کردہ کہ صد قافلۂ دل ہمرہ اوست

ہر کجا ہست خدایا بسلامت دارش

یار سفر کردہ کی واپسی کی دُعا۔

یارب سببی ساز کہ یارم بسلامت    باز آید و برہاندم از بند ملامت

بیقراری جب حد سے گذر جاتی ہے اور رنج و فراق ناقابل تحمیل ہو جاتا ہے تو حافظ یزد جانے کا قصد کرتے اور غربت کی صعوبت برداشت کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔

چو باد عزم سر کوی یار خواہم کرد

نفس بہوئی خوشش مشکبار خواہم کرد

حال آنکہ انھوں نے اس سے پہلے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا لیکن بادشاہ کی کشش نے شیراز چھوڑنے پر مجبور کیا۔

من کز وطن سفر نگزیدم بعمر خویش

در عشق دیدن تو ہوا خواہ غربتم

حافظ کا عزم مصمم تھا۔ وہ دریا کو طے کر کے یزد پہنچ ہی گئے۔ حافظ کے بعض سوانح نگار نے یہ بتایا ہے کہ حافظ نے ۷۷۰ھ میں یزد کا سفر کیا تھا اس سفر کا مقصد شاہ یحییٰ کی آستان بوسی اور مدح گذاری تھا چنانچہ وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

ای فروغ ماہِ حسن از روی رخشان شما

آبروی خوبی از چاہ زنخدان شما

شاہ یحییٰ کو مخاطب کر کے لکھی گئی لیکن سوانح نگاروں نے یہ واقعہ نظر انداز کر دیا ہے کہ اسی زمانہ میں شاہ شجاع بھی یزد کو گیا تھا راقم السطور کا خیال ہے کہ حافظ کے سفر کا اصلی مقصد یہ تھا کہ شاہ شجاع کا دیدار حاصل کریں۔ چنانچہ اس مقصد کی طرف صاف اشارہ مندرجہ ذیل شعر میں موجود ہے۔

دانی کہ چیست دولت دیدار یار دیدن

در کوی او گدائی بر خسروی گزیدن

از جان طمع بریدن آسان بود ولیکن

از دوستانِ جانی مشکل تواں بریدن

یزد میں چند روز ٹھیر کر شاہ شجاع شیراز کو واپس چلا گیا۔ لیکن حافظ اس کے ہمراہ نہ جا سکے۔ ان کے پاس سفر کا توشہ موجود نہ تھا۔ شاہ یحییٰ سے جو انعام و اکرام کی امید تھی وہ پوری نہ ہوئی اس کی مدح سرائی کا صلہ نہ ملا۔

شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد

مجبوراً حافظ کو یزد میں چند روز رُک جانا پڑا یہ زمانہ ان کے لئے بڑی پریشانی کا تھا۔ ایک طرف تو شاہ شجاع سے اور دوسری طرف شاہ یحییٰ کی عدم التفاتی، غریبی اور مفلسی سے پریشان ہو کر حافظ نے یزد کی تلخ زندگی اور اس شہر کی مذمت میں اشعار لکھے ہیں جن میں یزد کو منزل ویران کہا ہے اور شیراز کو مراجعت کی تمنا ظاہر کی ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم　　راحت جاں طلبم و زپی جاناں بردم

دلم از وحشتِ زنداں سکندر بگرفت　　رخت بربندم و تا ملک سلیماں بردم

چوں صبا با تن بیمار و دل بی طاقت　　بہواداری آں سرد خراماں بردم

اتفاقاً ان ہی دنوں خواجہ جلال الدین توران شاہ وزیر شاہ شجاع یزد میں موجود تھا اور شیراز کو واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا حافظ نے موقع کو غنیمت جان کر اس کے ہمراہ جانے کی خواہش ظاہر کی اور ایک قصیدے میں اپنی پریشانی کو بیان کرتے ہوئے اس سے اپنے ساتھ لے جانے کی درخواست کی۔

مرادلیست پریشاں بدست غم پامال　　چنانکہ ہیچ کسم نیست واقف احوال

شکستہ خاطرم و تنگ دل چو حلقہ میم　　خمیدہ پشت جفا دیدہ گاہ غصہ چو دال

زملک خویش بغربت فتادہ الم زنیساں　　کز نیستم بجہاں یکدرم زمال و منال

عزیمتِ وطن خود نمی توانم داشت　　بماندہ عاجز و مسکیں چو مرغ بی پر و بال

غریب و مفلس و محتاج در چنیں شہری

ہیچ نوع ندارم زخلق روی سوال

توران شاہ نے حافظ کی درخواست منظور کر لی اور حافظ پھر اپنے وطن واپس آئے وزیر کے اس احسان کے بدلے حافظ نے متعدد غزلوں میں اسکی مدح سرائی کی ہے۔

اسی زمانے میں جزیرۂ ہرموز کے حاکم تہمتن بن تورانشاہ نے بھی حافظ کو گرانبہا ہدایا و تحائف بھیج کر ان کو اپنے دربار میں بلا بھیجا لیکن سفر یزد کے تلخ تجربے کے بعد حافظ نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ اور در حقیقت یزد سے واپس آکر وہ عزلت نشین ہو گئے تھے وہ شاہ شجاع اور شیراز کو چھوڑ کر باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ حافظ کے کئی اشعار اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں

دل بنہ ای جان من بر وعدۂ شاہ و وزیر

کسی نمی داند کہ کارش از کجا خواہد کشاد

رو توکل کن نمیدانی کہ نوک کلک من

نقش ہر صورت کہ زد رنگی دگر بیروں فتاد

بی تو ای سرو روان گل و گلشن چہ کنم

زلف سنبل چہ کشم عارض سوسن چہ کنم

شاہ ترکاں چو پسندید بچاہم انداخت

دستگیر ار نہ شود لطف تہمتن چہ کنم

حافظا خلد بریں خانہ موروث منست

اندریں منزلِ ویرانہ نشیمن چہ کنم

۷۷۶ھ میں شاہ شجاع نے سلطان حسین جلایر فرماں روائے عراق کی کم سنی اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھاکر تبریز پر چڑھائی کر دی سلطان حسین کو شکست ہوگئی اور شاہ شجاع تبریز پر قابض ہوگیا کچھ سیاسی مصالح اور کچھ عیش و خوش گذرانی کی وجہ سے شاہ شجاع تبریز میں چار مہینے ٹھہر گیا۔ خواجہ حافظ کو اس موقع پر بھی بادشاہ کی جدائی کا غم ہوا۔ چنانچہ مندرجۂ ذیل غزل میں بادشاہ کی عدمِ توجہی کی شکایت کی ہے۔

یاد باد آنکہ ز ما وقت سفر یاد نہ کرد     بوداعی دل غم دیدۂ ما شاد نہ کرد

اسی حالت ذوق اور کیف فراق میں حافظ نے یہ غزل لکھ کر بادشاہ کو بھیجی۔

ای صبا گر بگذری بر ساحل رود ارس     بوسہ زن بر خاک آں وادی و مشکیں کن نفس

نام حافظ گر بر آید بر زبان کلک دوست

از جناب حضرت شاہم بس است ایں ملتمس

مذکورۂ بالا بیانات اور اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ کے دل میں شاہ شجاع کی بے انتہا محبت تھی۔ شاہ شجاع حافظ کا صرف مربی و ممدوح نہ تھا بلکہ وہ ان کا محبوب و معشوق بھی تھا۔ حافظ کی یہ محبت ایسے زمانے میں ہوئی جب شاہ شجاع جوان تھا اور حافظ عہد پیری میں داخل ہو چکے تھے۔ خود حافظ نے اس حقیقت کی طرف بھی بار بار اشارہ کیا ہے۔

پیرانہ سرم عشق جوانی بسر افتاد     واں راز کہ در دل بہ نہفتم بدر افتاد

چنگِ خمیدہ قامت میخواندت بعشرت     بشنو کہ پند پیراں ہیچت زیاں ندارد

دریں باغ از خدا خواہد دگر پیرانہ سر حافظ

نشیند بر لب جوی و سروی در کنار آید

ای دل شباب رفت و نچیدی گلی ز عیش

پیرانہ سر مکن ہنری ننگ و نام را

قدح پُر کن کہ من در دولت عشق     جواں بخت جہانم گرچہ پیرم

شاید بعض حضرات جو حافظ کے تقویٰ و تقدس کو اعلیٰ درجے کا قرار دیتے ہیں شاہ شجاع سے ان کی غیر فطری محبت کو بہتان تصور کریں گے۔ لیکن خود حافظ نے اپنے معشوق کی جو توصیف اشعار میں کی ہے اس معاملے میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں ہے۔

ای نازنیں پسر تو چہ مذہب گرفتہ ای

کت خون ما حلال تر از شیر مادر است

گر آں شیریں پسر خونم بریزد     دلا چوں شیر مادر کن حلالش

بتی دارم کہ گرد گل ز سنبل سایباں دارد

بہار عارضش خطی بہ خون ارغواں دارد

غبار خط بپوشانید خورشید رخش یارب
حیات جاوِدانش دہ کہ حسن جاوِداں دارد

تاریخ کے اوراق اور صوفیوں کے سوانح شاہد ہیں کہ عہد حافظ میں پسران خوبرو سے محبت کرنا اور انھیں معشوق بنانا عاشقانہ طبیعتوں کا عام انداز تھا۔ خود شاہ شجاع نے عراق کے نوجوان حسین شہزادہ حسین جلائری سے اپنے عشق کا اظہار کیا تھا۔ جب شاہ شجاع نے تبریز پر حملہ کرنے کا قصد کیا تو شاہزادہ نے شاہ شجاع کو خط کے ذریعے اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس خط کا جواب شاہ شجاع نے دیا۔ اسکی عبارت تاریخ حبیب السیر کے حوالے سے ملاحظہ ہو۔

"چوں سلطان حسین در کمال حسن وجمال بود بامردم عاشق پیشہ در طریق التفات سلوک می نمود شاہ شجاع مکتوب را بایں اسلوب نوشت۔

بجنگ عاشقاں داری دلیری
مکن جانا کہ عاشق ہم شجاع است


## نگارِ پاکستان کا خاص شمارہ

# مصحفی نمبر

مصد

جس میں اردو غزل کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش وجائے ولادت کی تحقیق، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت، ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقار ان کی تالیف و تصانیف۔ ان کی غزل گوئی و مثنوی نگاری۔ ان کے معاصر شعراء و ادباء اور ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اس میں مولانا نیاز فتحپوری کے متعدد مقالوں کے علاوہ دوسرے معروف نقادوں کے مضامین بھی شامل ہیں۔ غرض مصحفی کی تذکرہ نگاری شخصیت اور شاعری کے متعلق سارے مباحث اس خاص نمبر میں اس قدر حسن و ترتیب ومورخانہ کاوش و استدلال کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ مصحفی کو سمجھنے کے لئے کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قیمت :۔ تین روپے

دفتر نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

# شیطان سے مُلاقات

ت۔ا۔ن

(التباسِ بصری کا ایک سچّا واقعہ)

(چونکہ اِس واقعہ کے کردار ہنوز زندہ ہیں اس لئے ان کے نام لکھنے سے قصداً گریز کیا گیا)

---

(۱)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ بادش بخیر......... علی گڑھ کی یاد آتے ہی جذبات دفورِ شوق سے اُمنڈ آئے۔

جن دنوں کا یہ واقعہ ہے۔ اُن دنوں ہاسٹلوں میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ہر کمرہ میں چار چار طالب علموں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ جس کمرہ میں میری رہائش تھی اس کے ساتھ والے کمرے میں ایک طالب علم مدراس سے آئے تھے وہ موپلا قوم کے ممبر تھے۔ ان کو اردو آتی نہ تھی اس لئے وہ ہر وقت انگریزی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ فٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور یونیورسٹی کے تالاب میں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے گھنٹوں پانی کی سطح پر اِس طرح سے تیرتے جیسے لکڑی کا تختہ۔ تیراکی میں وہ یونیورسٹی میں اول آیا کرتے تھے۔ نہایت خوش طبع اور آزاد خیال کے آدمی تھے۔ بستر میں لیٹ جاتے اور سرہانے پڑی ہوئی میز سے کتابیں اُٹھا کر لیٹے لیٹے پڑھ کر واپس میز پر رکھ دیتے اور اسی طرح سے میز پر قرآن شریف اٹھا کر سوتے ہوئے پڑھ کر میز پر رکھ دیتے۔ دوسرے طالب علم بمبئی کے ایک بہت بڑے افسر کے صاحبزادے تھے۔ خاموش طبیعت کے سیدھے سادے انسان تھے۔ ان کو آرٹ سے خاص دلچسپی تھی۔ دنیا بھر کی تصاویر البم میں جمع کر رکھی تھیں۔ جب منڈولین بجاتے تو گویا مُردہ تاروں سے زندہ نغمات پیدا کر دیتے۔ اس لئے ہم ان کو "مسٹر آرٹ" کے نام سے پکارتے تھے۔

تیسرے صاحب مشرقی پنجاب کے کسی ضلع کے رہنے والے اور ایم۔ ایس۔ سی کے طالب علم تھے۔ ہر وقت سائنس کی عینک سے دیکھتے۔ ان کو ہم "مسٹر سائینس" کہا کرتے تھے۔ چوتھے طالب علم یو۔ پی کے کسی ضلع کے کسی بڑے افسر کے لڑکے تھے۔ ان کی عام گفتگو بھی بلند معیار اردو میں ہوتی تھی۔ اُن میں احساس برتری کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ہر معاملہ پر وہ اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھا کرتے تھے۔ دیوانِ غالب تقریباً سارا یاد تھا۔ ان کو اس لئے ہم "مسٹر غالب" کہا کرتے تھے۔ علیگڑھ کے دستور کے مطابق وہاں "مولانا" کہہ کر ایک دوسرے کو پکارا جاتا تھا۔ مگر ہم نے خود آپس میں ایک دوسرے کو "مسٹر" کے لفظ سے پکارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میرے لئے اس کمرے میں کشش کا باعث مسٹر آرٹ اور مسٹر سائنس تھے۔ پہروں مختلف مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا اور مسٹر آرٹ سے منڈولین سننے کی کشش مجھے ان کے کمرے میں روکے رکھتی۔

(۲)

ایک دفعہ مسٹر آرٹ کسی کام سے دہلی گئے اور وہاں سے ایک "پلانشے" (Planchette) خریدلا
اس وقت ہندوستان میں یہ آلہ نیا نیا آیا تھا اور اس کا ہر جگہ چرچا تھا۔ چنانچہ مجھے میرے کمرے سے بلایا گیا اور میز
اردگرد بیٹھ کر ہم نے نہایت احترام سے پیکٹ کھولا اور اس آلہ کو نہایت حیرت سے دیکھا۔ مسٹر آرٹ نے ہم کو بتایا ک
پر سفید کاغذ کے اوپر اس آلہ کو رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے سوراخ میں ایک پنسل لگادی جاتی ہے۔ ایک دو یا تین آدمی
اس پر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے سروں کو اس طرح سے رکھ دیتے ہیں کہ پلانشے پر بار نہ پڑے صرف اس کی سطح کو انگ
کے سرے چھو سکیں۔ اور سب ایک ہی روح کو طلب کرنے کا خیال دل میں جمائے رہیں۔ جب پلانشے میں حرکت پیدا
ایک ہی سوال دل میں رکھیں۔ طلب شدہ روح اس سوال کا جواب پلانشہ کی مدد سے دے گی۔ یعنی پلانشے میں حرک
پیدا ہوگی اور کاغذ پر جواب پنسل سے لکھتا چلا جائے گا۔

چنانچہ فرصت کے وقت کا ایک عمدہ مشغلہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ پہلے دو تین دن تک تو پلانشے میں جو حرکت
ہوتی تو کاغذ پر ٹیڑھی بیڑھی لکیریں بنتی چلی جاتیں۔ کچھ دنوں کے بعد کسی نامعلوم زبان کے حروف و الفاظ کاغذ پر نم
ہونے لگے۔ کئی دن کی مشق کے بعد انگریزی اور پھر اردو میں تحریریں نمایاں ہونے لگیں۔ مگر حیرت یہ تھی کہ ہمارا
کچھ ہوتا اور روح جواب کچھ دیتی۔ چنانچہ ہم نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ واقعی ارواح پلانشہ پر آکر جواب لکھواتی ہیں یا یہ
سائینس کی دھوکا بازی ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد مسٹر سائنس نے کہا کہ چونکہ شیطان تاحال زندہ ہے اس لئے اس کو طلب کر کے اس سے سو
کے جوابات طلب کئے جائیں۔

چنانچہ ہم نے شیطان کو بلانا شروع کیا۔ دو تین دن تک تو کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن چوتھے دن ان کاغذ پر یہ تحریر ظاہر ہ
"تم مجھے کیوں بلاتے ہو؟ تم سوال کروگے اور پلانشہ کے ذریعے جواب دوں گا۔" ہم نے اصرار کیا کہ ہم آپ کے روبرو گفتگو ک
چاہتے ہیں۔ چنانچہ کاغذ پر یہ جواب ظاہر ہوا "اگر تمھاری ایسی ہی خواہش ہے تو پھر علی گڑھ کے پرانے قلعہ کے مشرقی جا
والے حصہ میں اسی اتوار کو غروب آفتاب کے وقت میرا انتظار کرو۔ میں وہاں تم سے ملوں گا۔ مگر چونکہ میں بہت مصرو
ہوں اس لئے وقت کا خاص خیال رکھو۔ اگر تم ذرا لیٹ ہوئے تو میں انتظار نہ کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ ہاں یہ
سن لو کہ ملاقات کے وقت سے پہلے پھر مجھے پلانشہ پر نہ بلانا۔ مجھے فرصت نہیں۔"

یہ سن کر پہلے تو ہم بہت خوش ہوئے کہ ہم شیطان کو اصلی صورت شکل میں دیکھیں گے اور اس سے سوال و جوا
کریں گے۔ مگر دوسرے ہی دن ہمارے دلوں میں یکایک کچھ خوف سا پیدا ہونے لگا۔

ہم پانچوں میں بہت خفیہ طور پر اس قسم کے خطرات کے متعلق بات چیت شروع ہوگئی۔ کسی نے کہا ہم پابند
تھوڑے ہیں۔ ہم نہ جائیں گے۔ مگر مسٹر سائنس نے کہا یہ تو بہت بری بات ہوگی۔ شیطان کیا کہے گا کہ خود بلایا ہے اور
خود ہی اتنے ڈر گئے کہ آنے کی جرأت نہ کر سکے۔ یا پھر وہ سمجھے گا کہ انسان وعدہ فراموش ہے۔ آخر ہمارے ڈرنے کی
ہی کیا ہے۔ انسان ہمیشہ شیطان پر غالب آیا ہے۔

پھر بھی ہمیں خیال آتا کہ قلعہ بہت پرانا ہے اور غیر آباد و ویران پڑا ہے۔ دن کے وقت بھی وہاں جاتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں۔ سرِ شام اس کے غاروں سے گیدڑ نکل کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے بڑے بڑے گھنے درختوں سے اُلّوؤں کی خوفناک چیخیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی مشہور ہے کہ وہاں جن بھوت رہتے ہیں۔ شام کے وقت اندھیری رات میں وہاں جانا ویسے بھی خطرناک ہے۔ چنانچہ ہر روز اس موضوع پر سنجیدگی سے بحث کی جاتی اور کئی دفعہ یہ طے پایا کہ وہاں نہ جائیں گے۔ مگر پھر خیال آتا کہ شیطان ہم پر ہنسے گا۔ لہٰذا جانا ضروری ہے۔ مگر جوں جوں اتوار نزدیک آتا گیا ہمارے دلوں میں خوف و ہراس کا غلبہ ہوتا گیا۔ اور ہم بہت سنجیدہ ہوتے گئے۔ ہمارا زیادہ وقت خاموشی میں گذرنے لگا۔ یہاں تک کہ میرے کمرے والے ساتھیوں نے میری یہ حالت دیکھ کر ایک دن مجھ سے دریافت کیا کہ کیوں مولانا! ...... چند دنوں سے آپ بہت خائف نظر آ رہے ہیں اور اکثر رات کو نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ آخر کیا بات ہے؟ مگر میں ہنسی میں ان کی بات ٹال گیا۔ اور کہا کہ کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔ یہی حالت ہمارے دوسرے کمرے والے ساتھیوں کی تھی۔ اُن کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سخت گھبرائے ہوئے اور خوفزدہ ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے وحشت اور خوف نمایاں تھا۔ پھر دل ہم سوچتے کہ شیطان کی صورت کیسی ہوگی؟ کیا اس ہیئت کا مقابلہ ہم کر سکیں گے۔ کیا وہ ہمیں وہاں بُلا کر ہماری اس جرات کی کوئی سزا دے گا؟ یا اس کے آنے سے پہلے ہی قلعہ کے بھوت اور جن یا وحشی درندے ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔

بالآخر اتوار آ ہی گیا ـــ صبح سے ہماری حالت خراب تھی۔ ہم سب نے چھٹی کی۔ درخواستیں بھیج دیں اور تمام دن بستروں میں لیٹے رہے خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ کبھی تو ہم پاگلوں کی طرح باتیں کرنے لگ جاتے۔ کبھی حواس باختہ خاموش پڑے رہتے۔ آخر ملاقات کا وقت قریب آگیا۔ ہم ایک ایک چاقو جیب میں ڈال کر سیر کے بہانے ہوسٹل سے باہر نکلے۔ کسی طرح قلعہ پہنچے۔ اور مشرقی جانب غروب آفتاب سے چند منٹ پہلے حسب ہدایت زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر ہم ایک دوسرے کے نزدیک سمٹ کر آ گئے اور ایک دوسرے کے ہاتھ خوب مضبوطی سے پکڑ لئے۔ وحشت اور انتہائی خوف سے ہمارے حلق خشک ہو گئے۔ ہم ایک دوسرے سے بھی نہ بول سکتے تھے۔ ہمارے جسم بے جان اور بوجھل معلوم ہونے لگے۔ اس وقت اگر کوئی چھپ کر مذاق سے بھی کوئی ڈراونی چیخ نکالتا تو شاید ہماری روح بدن سے جدا ہو جاتی۔ ایک ایک منٹ پہاڑ ہو گیا۔

ہمارے جسم کا تمام خون سمٹ کر دل کے اندر آگیا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں یہاں آنے پر سخت پشیمان تھا اور چاہتا تھا کہ اب بھی بھاگ جاؤں۔ لیکن ہمارے پاؤں میں طاقت نہ تھی۔ "یا خدا ہماری مدد کر" میرے دل میں یہ خیال آیا۔ اب ہماری آنکھیں قلعہ کی شرقی دیوار کی طرف لگ گئیں اور ہم کسی سخت حملے کے انتظار میں منہمک ہو گئے کہ یکایک ایک درخت سے ایک اُلو نے کرخت آواز میں چیخ ماری اور پھڑ پھڑا کر تیزی سے اڑا اور فوراً ہمارے سامنے چند گز کے فاصلہ پر ایک دُبلا پتلا دراز قد سفید رنگ کا آدمی انگریزی سیاہ سوٹ میں کھڑا تھا۔ اس کی داڑھی مونچھ نہ تھی۔ ہم حیران ہو گئے کہ آسمان سے ٹپک پڑا ہے یا زمین نے اُسے اُگل دیا ہے کیونکہ کسی سمت سے اسکو آتے ہوئے ہم نے نہ دیکھا تھا۔ اس کے چہرہ سے مایوسی حسرت و ارمان تھکاوٹ ناامیدی اور پشیمانی کے جذبات صاف ہویدا تھے مگر اس کی آنکھیں! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ہزار ہزار کینڈل پاور کے بلب لگے ہوئے ہیں اور ان سے

اتنی تیز شعاعیں نکل رہی تھیں کہ ہمارے جسم کے آر پار نکل جا رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس تیز روشنی میں ہمارے دل کی کھلی کتابوں کو بغور پڑھ رہا ہے۔ حیرت و ہیبت کے جذبات ہم پر طاری تھے۔ اور ہماری زبانیں بند تھیں۔ چند منٹ کے بعد اس اجنبی نے خود سکوت کو توڑا اور گرجدار آواز میں یوں گویا ہوا۔ "آخر انسان ہو نا کہ مجھے اتنے اصرار سے بُلایا ہے اور جب میں یہاں آیا ہوں تو خوش آمدید تک نہیں کیا۔ اب چُپ کیوں ہو۔؟ بولو کیا دریافت کرنا چاہتے ہو؟" کچھ دیر تک تو ہم خاموش رہے پھر مسٹر سائینس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں ڈرتے ڈرتے رُک رُک کر کہا۔ "اچھا تو آپ ...... مسٹر شیطان ...... ہیں ...... کیا ...... یہی آپ کی ...... اصلی صورت ہے؟" شیطان نے کہا کہ "اگر میں اپنی اصلی صورت میں یہاں آتا تو آپ اوّل تو مجھ کو دیکھ ہی نہ سکتے۔ اور پھر اگر میں کوئی اور مادی شکل اختیار کرتا تو شاید برداشت نہ کر سکتے۔ اِس لئے میں آپ کی خاطر انسانی شکل میں ظاہر ہوا اگرچہ مجھے اس شکل سے سخت نفرت ہے" پھر مسٹر سائنس نے اُسی طرح ڈرتے ہوئے رُک رُک کر کہا۔ "آخر تم ...... ہم ...... بنی نوع انسان ...... کے دشمن ...... کیوں بن گئے ہو؟"۔ شیطان نے کہا، "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں مقرب الملائک تھا۔ بہشت میرا ٹھکانہ تھا۔ تمھارے جد امجد بہشت سے میرے اخراج کے باعث بنے۔ گو میں نے بھی فوراً ان سے بدلا لے لیا اور انھیں بھی بہشت سے نکلوا کر ہی دم لیا۔ مگر مجھے فکر ہے کہ پھر اولاد آدم نیکی کے دروازے سے بہشت میں نہ گھس جائے"۔ اب مجھ میں کچھ ہمت ہوئی اور ڈرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے آدم کو سجدہ کر لیا ہوتا۔" اس پر شیطان نے پھر گرجدار آواز میں کہا کہ "میں خدا کو چھوڑ کر انسان کا سجدہ کرتا اور اس طرح سے شرک کے گناہ عظیم میں مبتلا ہو جاتا حالانکہ اس گناہ کی کوئی معافی ہی نہیں۔" اس پر مسٹر سائنس نے پھر کہا۔ "دنیا میں آخر اور قومیں بھی تو ہیں۔ ہم مسلمانوں کو تم نے کیوں دھر لیا ہے؟" اس پر شیطان نے کہا کہ "نہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے اب میں مطمئن ہو چکا ہوں کہ وہ اب میری گرفت سے کبھی نہیں نکل سکتے۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر قرآن سے ہے کیونکہ جو اس کے نزدیک پہنچ جاتا ہے اس کے لئے بہشت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ مگر میں نے اب قرآن کے اِردگرد بہت مضبوط اور بلند حصار قائم کر دیا ہے اب کوئی مسلمان ان دیواروں سے چھلانگ لگا کر قرآن تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے علاوہ میں نے مسلم ممالک میں چپہ چپہ پر دیوتا قائم کر دئے ہیں اور اب اکثر مسلمان اللہ کے بجائے ان دیوتاؤں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور شرک ہی ایک ایسا مرض ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔ اس لئے اب مجھے مسلمانوں کی طرف سے بے فکری حاصل ہو چکی ہے۔ مگر دیگر اقوام میں تاحال بہت سے لوگ شرک سے قطعاً پاک ہیں اور نیکی بھی کرتے ہیں۔ اس لئے مجھے ان کی فکر ہر وقت بے تاب رکھتی ہے" مسٹر سائنس نے پھر کہا۔ "آخر آپ کو اب اس سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟" شیطان نے کہا۔ "فائدہ کا سوال نہیں، میرا فرض ہے کہ کسی انسان کو بہشت میں گھسنے نہ دوں۔ بلکہ ان کے راستے میں رُکاوٹیں ڈالوں کیونکہ بہشت اتنی سستی نہیں جتنی تمھارے علماء نے بنا دیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ دوزخ میں داخل ہوں گے ان کا ماحول مادی ہوگا یعنی ان کے لئے جسمانی لذائذ کے لئے ہر طرح کے مادی اسباب۔ لذیذ کھانے۔ شراب۔ عیش و عشرت اور دیگر جسمانی راحتیں فراہم کی جائیں گی کہ وہ ہر وقت انہی جسمانی لذائذ ہی میں محو رہ کر سہ جہتی سطح دماغ سے نزول کر کے دو جہتی احساس والی سطح دماغ پر آ جائیں گے اور پھر یک جہتی احساس والی سطح سے گذر کر ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائیں گے جس طرح حیوانات و حشرات الارض کا انجام ہوتا ہے۔ مگر مقابلتہً بہشت میں داخل ہونے والے

انسانوں کو تمام مادی لذائذ سے دُور رکھ کر اُن کی زندگی بہت منظم منضبط بنا دی جائے گی۔ ان کو بہت زیادہ ریاضت کرنی پڑے گی اور اپنے کردار کو بہت زیادہ بلند سطح پر لانا پڑے گا۔ اس لئے بہت جلد ہی وہ چہار جہتی احساس والی دماغی سطح سے پانچ اور پھر شش جہت احساس والی سطح دماغ پر ترقی کرتے جائیں گے۔ اس وقت وہ زمان و مکان کی سرحدوں کو عبور کر چکے ہوں گے۔ ماضی اور مستقبل مٹ جائیں گے اور ان کو ایسی ایسی روحانی مسرتیں حاصل ہوں گی جن کا ذکر کرنا بھی اس وقت مناسب نہیں کیوں کہ تم ان کیفیات کو سمجھنے کے قابل ہی نہیں ہو۔ اس پر مسٹر آرٹ نے کہا "مگر آپ تو ہمارے سامنے کبھی نہیں آتے پھر ہم سے گناہ کس طرح سرزد کراتے ہیں" شیطان نے کہا کہ "اول تو انسانی شکل و شباہت میں میرے ایجنٹ موجود ہیں۔ مگر یہ گناہوں کے ارتکاب کرانے کے خارجی اسباب ہیں۔ داخلی اسباب دانۂ گندم ہے۔ تمہارے سائنس دانوں نے تاحال گندم کا تجزیہ ہی درست نہیں کیا۔ اس میں گناہوں کے اجزاء شامل ہیں۔ انسان اس کو آگ پر پکا کر کھاتا ہے۔ میں نے انسان کو اس لئے آگ کا استعمال سکھایا ہے کہ وہ کھانے پکا کر کھانے کا عادی ہو جائے تاکہ میرے وجود والی آگ اس طرح اس کے جسم میں داخل ہو کر گناہ کے ارتکاب میں سرعت اور آسانی پیدا کردے۔ پھر میں نے انسان کو گوشت خوری کی عادت سکھائی تاکہ اس کے اندر درندگی اور وحشت کے اجزا پیدا ہو سکیں۔ سمجھے؟"

اب پھر میں نے پوچھا "کیا آپ ہمیں "روح" کی حقیقت بتا سکتے ہیں؟" شیطان نے کہا "میں صرف اتنا اشارہ کر سکتا ہوں کہ روح کی حقیقت ہرگز وہ نہیں جو تمہارے علماء نے تم کو بتائی ہے۔ مگر یہ مغالطہ بھی میں نے انسان کو دلایا ہے کیونکہ روح کے اس غلط تصور سے انسان شرک کی وبا میں آسانی سے مبتلا ہو سکتا ہے۔ اور یہی میرا مقصد تھا" اب مسٹر غالب نے کہا "ہم بہشت میں تو ضرور جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم نماز روزہ کے پابند ہیں" شیطان نے حقارت آمیز قہقہہ لگایا اور کہا "ضرور۔ ضرور۔ آپ نماز روزے کے پابند ہیں۔ مگر میں نے ہی تو "صوم" و "صلواۃ" کو "نماز" "روزہ" میں بدل دیا ہے۔ اگر مسلمان قوم صوم و صلواۃ کی پابند ہوتی تو تمام دنیا میں سب لوگ مسلمان بن چکے ہوتے۔ اسی طرح سے میں نے "الٰہ" کو "خدا" میں بدل دیا۔ چنانچہ تمہارے لئے اللہ اب خدا بن کر ایک بہت بڑا انسان بن چکا ہے جس کو تم نماز روزہ کی رشوت دے کر خوش کر لیتے ہو۔ الفاظ دراصل ذہنی تصورات کے علامتی اشارے (Symbols) ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے الفاظ کے بدلتے ہی تصورات بھی بدل جاتے ہیں چونکہ عوام کو الٰہ اور صوم و صلواۃ سے واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے میں نے ان تینوں تصورات کو بدلنے کے لئے الفاظ ہی بدل دئے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تمہارے نماز روزے بیکار ہو گئے ہیں اور تمہاری سیرت کی تعمیر نہیں کر سکتے۔ اب الٰہ سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں رہا صرف خدا سے ہے جو محض خوشامد سے خوش ہوتا ہے۔ لہٰذا اب تمہاری عبادات برائے حصول و تقویٰ نہیں ہوتیں بلکہ محض شاعرانہ قصیدہ خوانی۔ اس لئے تمہارے عمل بے نتیجہ ہیں۔ تم میں نفاق۔ اختلاف تفرقہ بازی۔ انتشار۔ بغض و کینہ۔ کذب گوئی۔ حُب زر۔ شہوت وغیرہ وغیرہ میں نے انتہائی شدت کے ساتھ پیدا کر دی ہیں۔ تمہارے بعض مذہبی رہنماؤں کا میں شکر گذار ہوں کہ وہ اس کار عظیم میں میرے ممد و معاون ہیں۔۔ بولو۔ کیا میں ہر قدم پر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں؟" اس پر مسٹر آرٹ کے منھ سے بیساختہ نکلا "خدا تمھیں سخت سزا دے گا" شیطان نے اس پر ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا اور کہا کہ "خدا مجھ سے باز پرس نہیں کرے گا۔ میں اگر ڈرتا ہوں تو

صرف اللہ تعالیٰ سے۔"

اب مسٹر موپلا نے دریافت کیا " اس دنیا میں " صحیح یا غلط " کا معیار کیا ہے ؟" شیطان نے جواب دیا۔ تمھارے اس سوال کا جواب دینے کے لئے میں پابند نہیں اور نہ ہی مجھے جواب دینا چاہیئے۔ مگر چونکہ تم طالب علم ہو اور میں تمھارے ذوق وشوق اور جستجو علم کی قدر کرتا ہوں اس لئے مختصراً بتاتا ہوں کہ سچ اور غلط دراصل کوئی مطلق اور مستقل حقیقت نہیں۔ ہر زمانہ میں جسے تم حقیقت اور صداقت سمجھتے ہو۔ وہ دراصل اضافی (Relative) ہی ہوا کرتی ہیں۔ تمھاری عقل اور نظریں محدود ہیں تم " مستقبل " کو نہیں دیکھ سکتے بلکہ " حال " کے بھی صرف ایک جزو کو بیک وقت دیکھ سکتے ہو۔ مگر کوتاہ نظری کے باعث تم اُس " جزو " کو " کل " سمجھ لیتے ہو۔ انسان جس وقت پیدا ہوا تو اسکا ذہن صرف دو جہت کا احساس کر سکتا تھا۔ اور اسی نسبت سے اس کا دماغ محدود تھا۔ پھر لاکھوں سال کے ارتقائی ترقی کے بعد اُس کے دماغ میں سہ جہت کا احساس پیدا ہوا اور ٹھیک اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجنے شروع کئے جو درجہ بدرجہ انسانی دماغ کو ترقی دے کر مختلف مدارج طے کراتے رہے تاکہ انسانی ذہن میں چہار جہت کا احساس پیدا ہوا اور وہ ایک بہت بلند سطح پر آگیا۔ ٹھیک اس وقت دین اسلام کا ظہور ہوا اور مسلمانوں کے ذمہ یہ کام ہوا کہ باقی ماندہ دنیا کے انسانوں کو وہ اس ارتقائی بلند وبالا سطح پر کھینچ کر لائیں اور وہ دن میرے لئے سخت غم وماتم کا تھا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور بہت جلد ہی پھر مسلمانوں کو کھینچ کر سہ جہتی مذاہب کی طرف واپس لانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور مسلمان اسلام کو چھوڑ کر ماضی کی سہ جہتی والی سطح دماغ کی طرف لوٹ گئے اور باقی ماندہ سہ جہتی سطح والے دماغی مذاہب کی بھی مسخ شدہ شکل کی کورانہ تقلید میں مصروف ہوگئے۔ مگر باقی اقوام نے اپنے اپنے مذاہب چھوڑ کر سائنس وفلسفہ کی مدد سے خوب ترقی کرنی شروع کی اور پھر مجھے فکرمند ہونا پڑا۔ مگر میں نے ان میں بین الاقوامی جھگڑے اور جنگوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کرادیا جو ایک عرصہ تک ان کو آگے بڑھنے نہ دے گا"

اس پر مسٹر غالب نے کہا " اب ہمارا کیا بنے گا ؟" شیطان نے کہا۔ " چونکہ تم میرے پروگرام پر عمل کرتے ہو لہٰذا تمھارا انجام جہنم ہی ہے " اس پر مسٹر آرٹ کے منہ سے بیساختہ نکلا " لاحول ولا قوۃ الا باللہ " اس کے منہ سے اس کلمہ کا نکلنا تھا کہ ہمارے سامنے صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، شیطان غائب تھا۔

ہمیں مسٹر آرٹ پر غصہ آیا کہ لاحول پڑھ کر اسے یکدم بھگا دیا حالانکہ ابھی ہمیں کئی سوالات اُس سے کرنے تھے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ چند منٹ تک تو ہم جمود کی حالت میں بیٹھے رہے۔ پھر اُٹھنے کی کوشش کی ——— اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوئے قلعہ کے باہر نکلے اور ہاسٹل پہنچے ———

---

جونہی میں اپنے کمرے میں داخل ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بیس میل کی بہت تیز دوڑ کر کے آرہا ہوں کہ جسم تکان سے چور چور تھا۔ چنانچہ میں بستر پر لیٹتے ہی بے ہوش ہوگیا۔

صبح جب میری آنکھیں کھلیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے والے ساتھی میرے اِرد گرد سخت متفکر کھڑے ہیں اور ساتھ ہی کرسی پر یونیورسٹی کے ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں اور میری نبض ان کے ہاتھ میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کوئی سوال کیا جس کا مطلب میں نہ سمجھ سکا اور یونہی کچھ جواب میں بڑبڑا دیا۔

دو تین دن کے بعد کچھ ہوش و حواس درست ہوئے۔ تو معلوم ہوا کہ دوسرے کمرے والے چاروں طلبا ابھی میری طرح سخت بیمار ہیں اور ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کا بخار میرے تجربہ میں کبھی نہیں آیا۔ حیرت ہے کہ پانچوں ایک ہی طرح کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سخت قسم کا دماغی صدمہ ان کو ہوا ہے جس سے ان کے جسم سے تمام طاقت سلب ہو چکی ہے۔

تقریباً پندرہ سولہ دن بیمار رہ کر ہم صحت یاب ہو گئے۔ اب ڈاکٹر نے بہت کوشش کی کہ ہم سے اس یک دم بیمار ہو جانے کے وجوہات معلوم کریں مگر ہم نے بہانہ بنایا۔ کسی نے کہا کہ شام کو فٹ بال کھیل کر آیا تھا۔ کسی نے ہاکی کسی نے ٹینس کھیل کا سہارا لیا۔ مگر ڈاکٹر کو یقین نہیں آیا۔ اس نے کہا کہ تم قصداً اصلی وجہ کو چھپا رہے ہو۔

مسٹر سائینس نے بستر سے اُٹھنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پلانشہ پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی اور میں نے فوراً شیطان سے جو سوال جواب ہوئے تھے قلمبند کر لئے کہ بھول نہ جاؤں۔ ہم بہت عرصہ تک خاموش رہے اور اپنی زندگی میں ایک بڑا انقلاب محسوس کرتے رہے۔

کوئی چھ سات ماہ بعد ایک دن میں نے اپنے سائیکالوجی کے پروفیسر سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ وہ یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا کہ "اس وقت مجھ سے مشورہ کیوں نہیں لیا کہ میں تم کو اس حماقت کے ارتکاب سے روک دیتا۔ تم نے اپنے لئے اور ہمارے لئے ایک بہت بڑی مصیبت خریدنی چاہی تھی کیونکہ آپ کے والدین کے روبرو تو ہم ذمہ دار ٹھہرتے اور ہمیں تمھاری اس حرکت کا علم تک نہ تھا۔ ایسے ماحول میں دماغی توازن کے متزلزل حالت اور خوف کے جذبے کی انتہائی شدید حالت میں بہت ممکن تھا کہ تم سب فوراً دہل کر مرجاتے۔ وگرنہ اس بات کا بھی سخت امکان تھا کہ سخت گھبراہٹ۔ شدید خوف اور بھیانک ماحول اور وقت کے لحاظ سے تمھارے دماغ کا نروس سسٹم ہی جل جاتا اور تم تمام عمر بھر کے لئے مفلوج یا پھر ہمیشہ کے لئے پاگل ہو جاتے۔ باقی رہا شیطان کا معاملہ تو دراصل وہ شیطان نہ تھا بلکہ وہ تمھارا اپنا ہی داخلی انعکاس یعنی التباس بصری تھا۔ (Hallucination)


## تین اہم کتابیں

**تدریس اردو** — اردو تدریس پر فرمان فتحپوری کی عالمانہ تصنیف جو زبان کی تعلیم و تدریس کے جدید ترین اصول و قواعد اور تازہ ترین قومی مسائل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ قیمت :- چار روپے

**اردو رباعی** — فرمان فتحپوری کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ جس میں اردو فارسی ادب کی تاریخ میں پہلی بار رباعی کے فن، موضوع اور ارتقا پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت :- پانچ روپے

**تحقیق و تنقید** — تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ جس میں فرمان فتحپوری نے زبان و ادب کے نہایت اہم اور نئے موضوعات و مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ قیمت :- تین روپے ۵۰ پیسے

# مسلم بادشاہوں کی رواداریاں

ڈاکٹر سیّد محمود

مسلم عہدِ حکومت کی اس خصوصیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے مذہبی تعصب اور جانبداری سے بلند ہو کر اس ملک پر حکومت کی ہے۔ انہوں نے مسلمان بن کر نہیں بلکہ خالص ہندوستانی بن کر اس ملک پر فرمانروائی کی ہے اور اپنے دامن کو ہمیشہ فرقہ پرستی سے پاک رکھا ہے اور ان کا عہدِ حکومت سیکولرازم کا بہترین نمونہ ہے۔

جہاں تک مخصوص مراعات کا تعلق ہے خواہ وہ اقتصادی ہوں یا سیاسی کسی مسلم رعایا کو خواہ افغانی یا ایرانی ہی کیوں نہ ہو قطعاً حاصل نہ تھیں اور نہ مسلم حکمرانوں نے کبھی رومن فاتحوں کی طرح اپنے مفتوح ملکوں کو دولت کھودنے کی کان بنایا۔ سلطنت کی بڑی سے بڑی ملازمت کے لئے بھی ہندوؤں کے لئے کوئی پابندی نہ تھی۔ نہ کوئی عہدہ کسی فرقہ کے لئے مخصوص تھا اور نہ دفاتر میں تعداد کا کوئی تناسب ہی مقرر تھا۔ اکثر سلطنت کے اونچے اونچے عہدوں پر ہندو فائز رہے ہیں اور یہاں تک کہ مسلم شہنشاہیت کے وزیر اعظم (دیوان) اور شاہی فوج کے سپہ سالار تک ہندو رہے ہیں۔ دربار کے امراء، منصبدار اور صوبے کے گورنروں میں ہندوؤں کی خاصی تعداد رہی ہے۔ کشمیر کے مسلم حکمرانوں نے ہمیشہ ہندو وزیر رکھے اور اسی طرح دکن کے سلطانوں کے دربار میں بھی ہندو وزراء کا دور دورہ تھا۔ غلام۔ تغلق۔ خلجی اور لودھی خاندانوں کے حکمران ہندو وزراء رکھتے تھے بھگوان داس کے بیٹے مان سنگھ پہلے شخص تھے جنہیں ہفت ہزاری منصب ملا۔ اس وقت تک پنج ہزاری منصب اُمرائے دربار کا آخری منصب تھا۔ آئینِ اکبری کا مصنف لکھتا ہے۔

"اکبر نے مان سنگھ کو ہفت ہزاری منصب دے کر انھیں تمام مسلمانوں سے اونچا کر دیا۔ یہاں یہ بھی غور طلب ہے کہ خالصتاً مسلم صوبے مثلاً کابل کے لئے ہندو گورنر مقرر کئے گئے۔

مسلمانوں کی اس حیرت انگیز رواداری پر متعجب ہو کر موجودہ دور کا ایک مورخ لکھتا ہے "افغان آبادی پر ایک ہندو صوبہ دار کی تقرری اس امر کی دلیل ہے کہ مسلم حکمراں ہندوستان کی مختلف نسلوں کے امتزاج سے ہندوستانیوں کو متحد کرنا چاہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایشیا کی سیاسیات میں یہ نہایت جرأت آمیز حکمتِ عملی تھی۔ مسلم بادشاہ اپنی اسٹیٹ میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کو رکھتے تھے اور یہاں تک کہ ہندوؤں کی تقرری پر زور دیتے تھے" ان تقرریوں کے علاوہ جن سے صاف طور پر ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک حقیقت اور بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس پورے دور میں کبھی بھی کوئی ایسا حکم نافذ نہ ہوا۔ جس کی رُو سے ہندوؤں کو صرف ہندو ہونے کے سبب کسی مرتبے یا عہدے سے محروم کیا گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم عہد کی پبلک سروس عوام کے اخلاق اور رواداری کے معیار کو اونچا اٹھانے میں کافی معاون ثابت ہوئی کیونکہ مسلم حکمران اسٹیٹ سروس کے معاملہ میں مذہب، نسل اور رنگ کے امتیازات سے مبرا تھے۔ ہندوستان کا کوئی بھی باشندہ خواہ وہ کسی مذہب اور نسل کا ہو۔ سلطنت کے اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچ سکتا تھا۔ جیسا کہ اکثر ہوا۔ ذاتی اوصاف اور حاکمِ وقت کی اطاعت۔ بس یہی دو صفتیں تھیں جس کے شہنشاہ طالب ہوا کرتے تھے۔

ایک سربرآوردہ مصنف کا خیال ہے کہ "ان مسلم حکمرانوں کے دماغ میں کبھی یہ خیال بھی نہ گذرا کہ وہ حکومت اور طاقت کے منصب صرف مسلمان ہی

کے لئے رکھیں۔" فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی یہ برابر کہا کرتے تھے کہ "ملکی حکومت میں مذہب کا کوئی دخل نہ ہونا چاہئے۔ اس کا تعلق صرف انسان کی نجی زندگی سے ہے۔" شہنشاہ اورنگ زیب کے متعلق یہ غلط بیانی کی جاتی ہے کہ اس نے ہندوؤں کو اسٹیٹ کی سروس سے نکال دیئے جانے کا حکم جاری کیا۔ یہ محض غلط ہے۔ اس نے محض یہ حکم دیا تھا کہ ماتحت اسامیوں میں جو تقرریاں ہوں۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں لئے جائیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب کی حکومت میں ہندو کثیر تعداد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور صرف امراء اور منصب داروں کی فہرست کا شمار دو سو سے زیادہ تک پہنچتا ہے۔ شیواجی کے داماد اچلاجی اور اودے پور کے رانا راج سنگھ اور اندر سنگھ شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار کے امراء اور سپہ سالاروں میں تھے انہوں نے اپنے فرقہ کی ضرب المثال وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ شہنشاہ کی خدمت کی۔ رگھوناتھ رائے ایک معمولی حیثیت کا آدمی جو نواب سعد اللہ خاں کی ملازمت میں تھا اپنی خداداد ذہانت اور محنت و قابلیت کی بدولت اونچے سے اونچے عہدہ پر پہنچا۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب کا وزیر اعظم ہوا۔ رگھوناتھ رائے اپنی حیات (۱۶۶۳ء) تک اس عہدۂ جلیلہ پر رہا۔ اورنگ زیب نے اپنے نجی خطوط میں بجز راجہ رگھوناتھ رائے اور نواب سعد اللہ کے کسی وزیر کی تعریف نہیں کی۔ رگھوناتھ رائے کی موت کا اورنگ زیب کو بہت صدمہ ہوا۔ شہنشاہ اورنگ زیب کا پیشکار یعنی چیف سیکریٹری ایک ہندو دلی رام نامی تھا۔ دیوان دلی رام کا ایک بڑا دلچسپ قصہ ہے جسے یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ جون کی گرمیوں میں ایک دن شہنشاہ اورنگ زیب نے دلی رام کو کسی خاص ضرورت سے طلب کیا۔ دلی رام چاندنی چوک (دہلی) میں رہتے تھے، چاندنی چوک سے لال قلعہ تک آنے میں جتنی عجلت ممکن تھی کی گئی۔ لیکن اس درمیان میں شہنشاہ کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہوگئے اور دیوان دلی رام کی موجودگی کا احساس ان کے دماغ سے جاتا رہا۔ دلی رام ایک گھنٹہ تک دروازے پر اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ اجازت ہو تو داخل ہوں۔ لیکن اورنگ زیب نے کوئی توجہ نہیں کی۔ اس پر دلی رام کے دل کو ٹھیس لگی اور وہ قلعہ سے باہر چلے گئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے اپنا مال و متاع غرباء میں تقسیم کردیا اور خود جوگی کا بستر دھارن کرکے جمنا کے کنارے جا بیٹھے چند گھنٹوں کے بعد جب اورنگ زیب کو دلی رام کا خیال آیا اور ان کے متعلق دریافت کیا تو یہ کہا گیا کہ گھنٹہ بھر انتظار کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ دوسرے دن دلی رام دربار میں نظر نہ آئے۔ جب اورنگ زیب نے خاص طور پر دلی رام کے متعلق دریافت کیا تو ان سے دلی رام کا یہ دلچسپ قصہ کہا گیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اپنی ملازمت کا چارج دیئے بغیر اس طرح فرار ہوجانے پر شہنشاہ فوراً دلی رام کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کرتے۔ لیکن اس کے خلاف شہنشاہ خود اپنے محبوب پیشکار سے ملنے کے لئے پاپیادہ روانہ ہوگئے۔ انھوں نے اپنے ہمراہ شاہی طبیب کو اور ایک پالکی بھی لے لی۔ تاکہ اگر دلی رام کے دماغ میں کچھ فتور آگیا ہو تو اس کا علاج کیا جائے جمنا کے کنارے پہنچ کر اورنگ زیب نے دلی رام کو گہرے مراقبے میں پایا اور کھڑے ہوکر اس کی مخاطبت کا انتظار کرنے لگے۔ جب دلی رام نے آنکھیں کھولیں تو شہنشاہ ہند نے انھیں ان الفاظ کے ساتھ مخاطب کیا۔

"تم نے بیس سال تک نہایت ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ میری خدمت کی یہ میری دلی خواہش ہے کہ تم اس اسٹیٹ کی خدمت انجام دیتے رہو اگر تمہیں اس بات کا صدمہ پہنچا ہے کہ تم ایک گھنٹہ تک دھوپ میں میرا انتظار کرتے رہے اور میں نے تمہاری طرف توجہ نہ کی تو براہ کرم معاف کردو۔ یہ باتیں بعض اوقات غیرارادی طور پر بھی ہوجاتی ہیں۔ بادشاہ اور رعایا کی مثال باپ اور بیٹے کی ہے اس لئے تمہیں ان غلطیوں کا خیال نہ کرنا چاہئے اور اگر تم بیمار ہو تو میرے طبیب موجود ہیں اور یہ پالکی بھی ہے۔ جس میں تمہیں آرام سے گھر پہنچا دیا جائے گا۔"

دلی رام مسکرایا اور جواب دیا "شہنشاہ عالم جب میں آپ کی ملازمت میں تھا تو میں ایک گھنٹہ آپ کی خدمت میں کھڑا رہا اور آپ مخاطب نہ ہوئے۔ لیکن اب جبکہ میں نے اپنے حقیقی مالک کی خدمت شروع کردی تو حضور خود میرے پاس پاپیادہ تشریف لائے ہیں۔" اس جواب پر اورنگ زیب ہکا بکا رہ گیا۔ اور دلی رام کو خدا کی عبادت کے لئے وہیں چھوڑ کر آہستہ سے واپس ہوگیا۔

ایک بار شہنشاہ اورنگ زیب سے چند درباریوں نے عرض کی کہ وہ دو غیر مسلموں کو ان کے عہدوں سے موقوف کردے۔ صرف اس لئے کہ یہ دونوں غیر مسلم تھے۔ اس بات کی دلیل میں انھوں نے قرآن شریف کی ایک آیت بھی پیش کی "اے مومنو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ سمجھو۔" اس پر

شہنشاہ نے جواب دیا۔ "نظامِ مملکت میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہونا چاہئے اور اس قسم کے معاملوں میں کسی مذہبی تعصب کو راہ نہ دینی چاہئے۔" اورنگ زیب نے بھی اپنی دلیل میں ایک آیت پیش کی۔ "تمہارے لئے تمہارا دین اور ہمارے لئے ہمارا دین" آگے چل کر اورنگ زیب نے یہ بھی کہا "آپ حضرات نے اپنی دلیل میں جو آیت پیش کی ہے، اگر اس پر ہم حرف بہ حرف عمل درآمد کریں تو ہمیں ان تمام رجواڑوں اور ان کی رعایا کو تباہ و برباد کر دینا چاہئے، لیکن یہ صحیح نہ ہوگا حکومت ہند کے عہدے صرف اہلیت کی بنا پر دینے چاہئیں اور اس میں کسی دوسرے خیال کا دخل نہ ہونا چاہئے۔"

ان حقائق سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ حکومت کس طرح تعصب سے بالاتر رہا ہے۔


# "نگار پاکستان" ۱۹۶۴ء کا سالنامہ

# "تذکروں کا تذکرہ"

# نمبر ہوگا

اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کرے گا کہ:۔

۱۔ تذکرہ نگاری کا فن کیا ہے؟
۲۔ اس کی امتیازی روایات و خصوصیات کیا رہی ہیں؟
۳۔ تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا ہے؟
۴۔ اردو فارسی میں آج تک کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں؟
۵۔ تذکروں اور ان کے مصنفین کی کیا نوعیت ہے؟
۶۔ ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے؟
۷۔ ان تذکروں سے خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے؟
۸۔ ان میں اردو فارسی زبان و ادب کا کتنا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے؟
۹۔ یہ خزانہ، ادب کے تاریخی۔ تحقیقی، سوانحی اور تنقیدی شعبوں کے لئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ہے

ضخامت: تقریباً ۲۵۰ صفحات

قیمت: چار روپے

"انیسویں صدی کی ایک صحافتی و ادبی دستاویز"

# "عطرِ فتنہ"

عقیل احمد جعفری

۱۸۸۳ء میں لسان الملک حضرت ریاض خیر آبادی نے عطر فتنہ کے نام سے اپنی جدت طبع سے پاکٹ سائز کا ایک ننھا منا، رنگ برنگی، چھوٹے چھوٹے ورقوں پر رسالہ نکالا تھا۔ جس کی لطافت و ظرافت کی دھوم اس وقت کی پوری ادبی دنیا میں تھی۔ اب امتدادِ زمانہ سے نہ وہ لوگ رہے نہ وہ مذاق! تاہم پاکیزہ ادبی ذوق اور رندانہ مذہبی جوش کے کچھ نمونے کہیں کہیں سے پیش کرتا ہوں

## یادگار واقعات

### ۱۔ سرسید

اپنے وقت میں معاصرین کو سرسید سے مذہبی، سیاسی، ادبی سبھی طرح کے اختلاف تھے۔ دیکھئے اس اختلاف کا اظہار کس لطف سے ہوتا ہے۔ یہ اختلاف، اختلاف امتی رحمتی تھا، جو ذاتیات پر مبنی نہیں بلکہ اصول پر مبنی تھا۔

ہمارے جلے تن سرسید نے ایک مضمون میں لکھا ہے:-

سن لو اے دور و نزدیک کے دوستو سن لو!

اے دکن اور اتر کے دوستو سن لو!

اے پورب اور پچھم کے دوستو سن لو!

اے آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والو سن لو! وغیرہ وغیرہ

یہ تہذیب الاخلاق والے رفارمر کی تحریر ہے یا کوئی سفلی عمل پڑھا جا رہا ہے۔ پورب باندھوں، پچھم باندھوں، تر باندھوں دکھن باندھوں۔ زمین آسمان باندھوں۔ پونا پانی باندھوں —— اگر کہ ہے تو صرف لونا چماری کی دہائی کی —— اس کے بعد آپ (سرسید) مخالفوں کو فرانس چلنے کی اس طرح دعوت دیتے ہیں۔ جیسے بازاری گالم گلوج

میں بک اُٹھتے ہیں کہ چلو سڑک پر!

ہمارے سرسید کو عاقبت کی فکر ہو نہ ہو اپنے گورِ گڑھے کی بھی فکر ہے۔ اگر نہیں ہے تو ہم ان مردِ آخر بیں تسلیم نہ کریں گے۔ اور اگر ہے تو ہمیں بتائیں۔ ہم ان کے خیر اندیش ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جس طرح مدرسۃ العلوم کی بابت ان کی محنت ٹھکانے لگی ان کی مٹی بھی ٹھکانے لگے ۔۔

۔۔ بیوقوف ایسے الفاظ کو فالِ بد سمجھیں تو سمجھیں۔ گور گڑھے کی فکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدانخواستہ سید کوچ کا قصد کریں یا ہماری طرف سے تقاضا سمجھیں۔ خدا ان کی عمر میں اسی قدر برکت عطا فرمائے۔ جتنی اپنے فرشتۂ خاص کو عطا کر چکا ہے۔

یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ علی گڈھ کی سرزمین نے اس کے لئے بے طرح کشش دکھائی ہے۔ ورنہ لندن جا کر ان کا واپس آنا یعنی چہ ۔۔ جیتے جی اس نے ان کو بزور کھینچا خدانخواستہ مرنے پر واگذاشت کی کیوں ٹھہرائے گی مگر یہ پتہ نہیں چلتا علی گڈھ میں کس جگہ کی زمین ہے۔

یہ کچھ ہم لوگ تو نہیں جن کے لئے کہنا پڑے ؎

ہم میکشوں کی لاش کو ملتی نہیں جگہ    حسرت پکارتی ہے کہ مٹی کہاں کی ہے

ان کی مبارک لاش کے لئے تو ہر طرف سے زمین دوڑے گی۔ خصوصاً جب پہلے تصفیہ نہ ہوا ہو۔۔ قرین قیاس تو یہ بھی ہے کہ یہ حضرت والہ و شیدائے مدرسۃ العلوم میں جب پسند کریں گے تو وہیں کی زمین کو۔ جس سے ایک فائدہ یہ بھی رہے گا کہ مقبرہ کے لئے بہت کچھ عمارت متعلقہ مقبرہ کی ضرورت نہ پڑے گی کسی کمرہ میں اگر زمین دوز قبر پسند کر لی تو چار دیواری اور گنبد کا بھی جھگڑا گیا۔ اور اگر علیحدہ جگہ لی تو مقبرہ کی عمارت سے مدرسۃ العلوم کی نمود اور بھی بڑھ جائے گی۔ خیر وہ بیرونی زمین کو پسند کریں یا اندرونی زمین کو۔ چھوٹے سے احاطہ میں سرو نما کچھ نشان نظر آئے یا زمین دوز قبر پر سبزی لہرائے۔ یہ ہوگا جبھی کہ پہلے سے تجویز قانون کی کسی دفعہ سے متعلق کر دی جائے۔ تاکہ اس اکھاڑے کے پچھیتے پہلوان مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو وقت پر اڑنگا لگانے کا موقع نہ ملے ۔۔ وہ جانشین کے اکھاڑ دینے کو تو چوکے نہیں۔ بعد کو گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا دریغ کریں گے۔

انہیں کب تاب آئے گی کہ مرنے کے بعد سرسید مدرسۃ العلوم پر دائمی قبضہ کریں۔ لائف سکریٹری ہونے کے لئے تو موت نے وقت محدود کر دیا تھا اس کے لئے تو بہ اعتقاد سرسید قیامت بھی نہیں ہے۔

بھلا کجا نیچرستان علی گڈھ اور کجا شاعری مگر کیا کہیں اور کس سے کہیں، لوگوں نے شاعری کی مٹی اپنے ہاتھوں خراب کرائی۔ تعریف میں بڑے بڑے قصیدے لکھ لکھ کے۔ داد لے لے کے اور لغات پر ریویو لکھوا لکھوا کے پیرِ نیچر کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ وہی مثل ہوئی۔

پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند

بھلا پوچھئے جس شخص کو خدا کے کلام میں تاویلات و توجیہات لاطائل نکالنے میں باک نہ ہو اسے اپنی مادری زبان بگاڑنے میں کیا تکلف ہو سکتا ہے ہم کو تو اسی دن خیر نظر نہ آئی تھی۔ جب ہم نے جسٹس محمود کو الہ آباد

کانفرنس میں شاعری کی ٹانگ توڑتے دیکھا تھا۔
اب سید صاحب اردو شاعروں پر منہ آنے لگے ہیں اور ادکھیاں سنانے لگے ہیں۔ آپ اپنے "علی گڑھ گزٹ" میں ایک مضمون تحریر فرماتے ہیں۔
"کیا اردو اشعاروں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
یا علی ۲ دیکھئے وہ ٹھوکر کھائی نا۔ ماشا اللہ چشم بد دور کیا جمع منتہی الجموع ارشاد فرمائی ہے کہ واہی وا ——— حضرت اشعاراتوں فرمایا ہوتا تو ٹھیک بنتا۔ سچ ہے ؎

تا مرا سخن نگفتہ باشد　　عیب و ہنرش نہفتہ باشد

دشمنوں کے کان بہرے سننے میں آیا ہے۔ سمیع اللہ خاں صاحب بہادر سرسید پر داغنے والے ہیں ارے بھئی کیا شاید فرانس میں جا کر ڈول ہو گی۔ نہیں نہیں صاحب کیا بندوق پستول سمجھے ——— بھائی جان نالش داغنے والے ہیں۔ دعویٰ یہ ہوگا کہ سرسید نے ٹرسٹینر بل کا جو قانون بے ضابطہ منظور کرالیا ہے خارج کیا جائے۔
اچھا۔ سہی سمجھے ہے کہ شاید مولوی سمیع اللہ خاں صاحب خاموش ہو رہے اور اس کے ساتھ ہی موج ذرا ہماری نظر سے کچھ اتر سے گئے تھے۔ کیا معنی جب اس طرح چپ ہو رہنے کا ارادہ تھا تو ٹھائیں ٹھائیں کیوں کی تھی۔ مگر نہیں۔ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب بھی دھن کے پکے ہیں اور دھن کیا انصاف بھی یہی ہے۔
ارے بھائی سید محمود ہزار بار سیکریٹری مقرر ہوں عمر بھر کے لئے نہیں قیامت تک کے لئے! چنانچہ خود مولوی صاحب کہتے ہیں کہ جب وقت آئے گا تو سب سے پہلے سید محمود کی نسبت رائے دینے والا میں ہی ہوں گا ——— مگر گفتگو تو یہ ہے کہ جو کچھ تصفیہ ہو وہ باضابطہ ہو ہاں اس کا خیال رہے کہ جھگڑے کا اثر سید کی ذات یا مدرسۃ العلوم پر نہ پڑنے پائے۔

## تنقید ادب

### ۱۔ حالی

ہمارے مولانا حالی صاحب ایک تو فصاحت سے خالی دوسرے آپ کی نیچرلٹی بھی انوکھی نرالی ——— فرماتے ہیں۔

فصلِ خزاں ہے تس پہ پھولی نہیں سماتی
مژدہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سنایا

تس پر کی وضاحت قابل داد ہے۔

### ۲۔ "ثمرۂ دیانت"

#### از قاضی عزیز الدین احمد

فتنہ ؎　　اے دیانت بر تو لعنت از تو رنج یافتم

## ۳۔ خمخانۂ جاوید

پہلی جلد میں لالہ سری رام نے الف ب ختم کی ـــــ تذکرہ کے اعتبار سے یہ شاعروں کی صرف ایک فہرست ہے۔
لالہ سری رام فرماتے ہیں مولانا حالی کو نیچرل شاعری کا شوق چچا (پیارے لال آشوب) کی صحبت میں ہوا۔ تعجب ہے چچا کی صحبت کا اثر بھتیجہ پر کچھ بھی نہ ہوا ـــــ تذکرہ کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کا نہیں، کوئی پاٹودی یا جھجھر کا رہنے والا اس کا مصنّف ہے۔

## جلالؔ لکھنوی

آپ نے ایک مرتبہ رامپور کے مشاعرہ میں ایک شعر پڑھا ـــــ مولانا عبدالحق منطقی خیرآبادی کو وجد آگیا۔ جھوم اٹھے رونے لگے ؎

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا راز  
آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجھ کو

دو تین شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

نجات ہو گئی ناصح سے عمر بھر کے لئے  
اسی کو بھیج دیا یار کی خبر کے لئے

....

یہ کہہ کر کروٹیں شب کو ترے ناکام لیتے تھے  
وہ دل کیا ہو گیا رہ رہ کے جس کو تھام لیتے تھے

....

دفن کرنا اپنے کوچہ میں جہاں تک ہو سکے!  
اور وقتِ مرگ ہم تم سے وصیت کیا کریں

....

لو امتحان تم مرے نالوں کا شوق سے  
کیوں ڈر کے آسمان کے نیچے سے ہٹ گئے

....

ایک مرتبہ خواب خلد آشیاں کے سامنے کسی لفظ پر آپ نے شک ظاہر کیا۔ نواب صاحب نے ـــــ مولوی غیاث (صاحبِ غیاث اللغات) کو طلبی کا حکم دیا۔ جلالؔ نے کہا وہ کیا جانیں انہیں بس لونڈے پڑھانا آتا ہے۔ نواب صاحب کو یہ بات ناگوار گذری اسی وقت دربار سے اٹھ کر چلے گئے ـــــ
نواب کلب علی خاں کی یہ عادت تھی کہ جب مہاجبینی کی کوئی بات خلاف مزاج ہوتی تو دربار برخاست کر دیتے۔

## تبرکات

### ۱۔ چندا ماہِ لقا (چاند بی بی)

عہد عالمگیرؒ میں ان کی جاگیر حیدرآباد دکن میں بہت کچھ شہرت رکھتی تھی۔ اور یہ ہمیشہ سیکڑوں سپاہیوں

کے باڈی گارڈ کے آگے اسلحہ لگائے گھوڑے پر سوار سیر و تفریح کو نکلا کرتی تھیں ۔ یہ بات بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آپ شاعرہ بھی تھیں۔ اور عمدہ شعر کہتی تھیں۔ یہ شعر اگر یہ کہتیں تو بہت موزوں ہوتا۔

میں فوج میں ہوں پیشہ ہے میرا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

یہ واقعات ایک علم دوست یورپین سے معلوم ہوئے جس کو چندا مہ لقانے اپنا دیوان ۱۷۹۹ء میں دیا تھا اور اس علم دوست انگریز نے یہ دیوان لندن کے کتب خانہ میں دے دیا اگر لندن کا کتب خانہ نہ ہوتا چندا کا نام اس قدر روشن نہ ہوتا ۔ نمونہ کے طور پر دو شعر لکھے جاتے ہیں۔

اخلاق سے تو اپنے واقف جہاں رہے گا — پر آپ کو غلط کچھ سب پر گماں رہے گا

...

اک لخت پارہ پارہ کر ڈالوں آئنے کو — پر کیا کروں کہ تیرا منہ درمیاں رہے گا

## شعر مضطر

پڑ گئے زلفوں کے پھندے اور بھی — دل کو یہ الجھن ہے چندے اور بھی

...

اے خدا باقی ہیں بندے اور بھی! — ان کو تھوڑا بانکپن دے اور بھی

...

## تاریخِ وفات سید طفیل احمد کرمانی خیر آبادی

سید طفیل احمدؒ چوں شد رواں زگیتی — در خوں طپید دلہا اندوہ و رنج بے حد
منشی ریاض احمد شد بے پدر دریغا — اندر ریاض معنی ناگہ خزاں چہ سر زد
رفت از جہانِ ہستی شد آنجہاں بہشتی — بادا طفیل احمدؐ با رحمتِ محمدؐ
معذورم از زدوری تاریخ شد ضروری — در یتیم اشکم با تعزیت بر آمد

سال وفات ہجری اے ہاشمی چہ پرسی
شد در جناں زگیتی سید طفیل احمد
۱۳۱۵ھ

از ہاشمی صفی پوری

## امیر مینائی

۱۸۸۵ء میں خدائے سخن حضرت امیر کسی خاص ضرورت سے لکھنؤ تشریف لائے۔ حضرت حکیم لکھنوی

خلف حضرت اسیر لکھنوی نے ایک صحبت مشاعرہ قرار دی۔ جسکی علت غائی حضرت امیر کا کلام سننا تھا اس میں شائقین نزدیک و دور سے محظوظ ہونے کے واسطے آئے تھے۔ کمترین بھی حاضر تھا۔ رات کے دو تین بج گئے تھے لوگوں کا اشتیاق بڑھ رہا تھا آخر حضرت امیر نے اپنی غزل شروع کی۔ اس زمین میں قریباً کل اساتذہ کی غزلیں ہیں۔ خود حضرت امیر کے تاریخی دیوان مراۃ الغیب میں سہ غزلہ موجود ہے۔ لیکن حضرت نے قریب ستو اشعار کے اس موقعہ پر ایک غزل تازہ کہی جسکا ایک مصرع بھی پرانی غزلوں سے نہیں ملتا۔ جس وقت یہ غزل شروع ہوئی ہے سامعین فرطِ شوقِ استماع میں یوں لوٹے پڑتے تھے جیسے شمع پر پروانے۔

اندھیر کر رہی ہے یہ چشمِ سیاہ میں — شوخی کو قید کیجئے نیچی نگاہ میں
اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں — مشعل دکھائی برقِ تجلی نے راہ میں
توبہ بھی کچھ بھروسہ کے قابل ہے زاہد — پہنچی ہے ہم سے لوٹ کے اب خانقاہ میں
وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں! — ہم شاد ہیں کہ ہیں تو کسی کی نگاہ میں
قالب میں دل ہے دل میں ہے وہ قدر دان دل — یوسف گرا ہے لے کے زلیخا کو چاہ میں
دل میں صمد صمد ہو زباں پر صنم صنم — حسنِ عمل کی بھی ہو جھلک کچھ گناہ میں
آنسو ہمارے دیکھ کے خوش ہو رہے ہیں وہ — پازیب موتیوں کی ہے پائے نگاہ میں
دے تیغ ناز اب تو جو تو نے اٹھا لیا — لیتا نہیں مجھے کوئی اپنی پناہ میں

سودا و میر دونوں تھے کامل مگر امیر
ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

...

## مہاراجہ چندولال شاداں

مہاراجہ چندولال مدار المہام دکن، شعر و سخن کا بہت شوق رکھتے تھے اور انکا کلام، کلام الملوک سمجھا جاتا تھا۔ بلا ناغہ شب کو ایک طبعزاد غزل سنا کر حاضرین، خوشامدین، ملازمین سے داد لیا کرتے تھے۔ ایک دن لالہ صاحب کی طبعیت کچھ فکر نہ کر سکی۔ شوقین شام ہی سے مدح کی آتشبازی لے کر آ دھمکے تھے راجہ صاحب نے حسب معمول دربار کیا۔ دیر تک جب سکوت سے لوگ اکتانے لگے تو لالہ صاحب تاڑ گئے ــ لالہ صاحب نے فرمایا حاضرین آج بسبب ناچاقی ... یہاں تک فرما چکے تھے کہ باہر کے کمرہ سے واہ واہ سبحان اللہ ماشاء اللہ، شعر اس کو کہتے ہیں، کیا ذہن رسا پایا ہے، کے نعرے بلند ہونے لگے۔ لالہ صاحب خفیف ہوئے کہ آج تک کن کوڑھ مغزوں کو میں کلام سناتا رہا۔ اسی دن سے عہد کیا کہ اب ان بد دماغوں کو کچھ نہ سناؤں گا بلکہ شاعری کا مشغلہ بھی ترک کر دیا ــــ

# گردش زمین آپ دیکھ سکتے ہیں

یاز فتحپوری

۶۵ سال اس طرف کی بات ہے کہ درس نظامی کی مشہور کتاب "ہدیۂ سعیدیہ" مجھے سبقاً سبقاً پڑھائی جارہی ہے۔ رامپور کے مدرسۂ عالیہ کے ایک ت بڑے فاضل مولانا وزیر محمد خاں میرے استاد ہیں اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ "ابطال حرکت زمین" کے مسئلہ پر تقریر فرمارہے ہیں میرے ساتھ طلبہ نہایت عقیدت کے ساتھ سُن رہے ہیں۔ لیکن میں برابر پہلو بدل رہا ہوں۔ مولانا سمجھ گئے کہ میں مطمئن نہیں ہوں اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا بات ہے؟ یں نے عرض کیا کہ اس کتاب میں جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ان کا تعلق قیاس و منطقی مفروضات سے ہے حقائق سے نہیں انہوں نے فرمایا کہ اگر حقائق کا تعلق صرف محسوسات و مدرکاتِ ظاہری سے ہے تو ہمیں بتاؤ کہ حرکتِ زمین کا مشاہدہ عینی کس طرح ممکن ہے چونکہ میں اس سے پہلے یونارڈ ڈیبیٹن اور فرانسیسی ول فیون کے وہ مضامین دیکھ چکا تھا جن میں حرکتِ زمین کے مشاہدہ کی عملی صورت بتائی گئی ہے۔ اس لئے میں نے عرض کیا کہ "ہاں یہ ممکن ہے" اور اس تفصیل میں نے ان پر ظاہر کردی اور وہ مسکرا کر خاموش ہوگئے۔

ان دونوں حکماء کا تجربہ حرکتِ زمین کے مشاہدہ کے متعلق بڑی دلچسپ چیز ہے اور ہر شخص اگر وہ تھوڑا سا اہتمام کرے تو اپنی آنکھ سے زمین کو حرکت رتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے "قانونِ حرکت" کا ایک کلیہ سمجھ لیجئے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ کسی رقاص یا (Pendu Lum) کو جیسا کہ آپ نے ہر کلاک میں لٹکتے ہوئے دیکھا ہوگا جنبش دیں گے تو اس کی سمت حرکت ہمیشہ ایک ہی رہے گی یعنی دیوار کے متوازی جس خط پر وہ جھول رہا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی یہاں تک کہ اگر آپ دائرہ کی صورت میں بھی ایک بار اسے گردش دیدیں تو وہ تھوڑی دیر میں پھر اپنے اصلی خطِ حرکت پر آجائے گا۔

اب تجربہ کی صورت یہ ہے کہ پرسکون کمرہ میں آبادی سے ذرا الگ سیسہ یا لوہے کی ایک وزنی نوکدار گولی کسی تار سے باندھ کر چھت کے کسی کڑے سے لٹکا دیجئے اور اسے جھٹکا دے کر جنبش میں لے آئیے تاکہ وہ آزادی سے ادھر اُدھر جھولنے لگے اب اس رقاص کے نیچے ایک میز رکھئے اور اس پر کھریا مٹی یا کوئلہ سے ایک دائرہ کھینچ دیجئے۔ اس کے بعد میز پر ریت کی تہہ اس طرح بچھا دیجئے کہ رقاص یا گولی کی نوک اسے چھوتی ہوئی اور ایک خط بناتی ہوئی گزر جائے۔ اب آپ نہایت غور اور صبر سے اس کا مطالعہ کیجئے۔ ایک گھنٹہ نہ گزرے گا کہ آپ دیکھیں گے گولی کی سمتِ حرکت بدلی اور ریت پر ایک زاویہ بنانے لگی۔ چونکہ اصولاً گولی سطح رقص یا سمتِ حرکت نہیں بدل سکتی اس لئے ظاہر ہے کہ یہ زاویہ میز کی گردش سے پیدا ہوا اور میز کی یہ گردش، گردشِ زمین کی وجہ سے وقوع یں آئی۔ وہ مقامات جو خط استواء پر واقع ہیں وہاں یہ تجربہ زیادہ نمایاں اثرات نہ پیدا کرے گا لیکن جو مقامات ۳۰ درجہ عرض البلد پر واقع ہیں (جیسے ملتان) وہاں یہ گولی ۴۸ گھنٹے میں دائرہ ختم کرے گی اور قطبین پر پورا دائرہ۔ اگر آپ کمرہ میں تیز روشنی کرکے یہ تجربہ کریں گے تو آپ بیّن طور پر گردشِ زمین کا مشاہدہ د کر لیں گے۔ اس سے زیادہ آسان و واضح صورت اس تجربہ کی ایک اور ہے۔

کسی کمرہ میں ایک گہرا پیالہ یا ٹب جس کا قطر کم از کم ایک فٹ کا ہو پانی سے بھر دیجئے اور چند گھنٹوں تک اسے اپنے حال پر رہنے دیجئے۔ اس کے بعد باریک پسی ہوئی رال پانی پر آہستگی سے اس طرح چھڑک دیجئے کہ اس کی تہہ پانی کی سطح پر تیرنے لگے۔ پھر باریک پسا ہوا کوئلہ پیالے کے مرکز سے کنارہ تک اس طرح چھڑک دیجئے کہ ایک خطِ مستقیم قائم ہو جائے۔ اسی کے ساتھ پیالے کے کنارہ پر بھی ایک خط کوئلے کے سفوف کا کھینچ دیجئے۔ چند گھنٹوں کے لئے آپ باہر چلے جائیے جب آپ لوٹ کر آئیں گے تو دیکھیں گے کہ پانی کی سطح پر جو لکیر کوئلہ کی تھی اس نے اپنی جگہ بدل دی ہے اور اس سیاہ لکیر سے علیحدہ ہو گئی ہے جو پیالے کے کنارے پر اسی سلسلہ میں بنائی گئی تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پیالے کے اندر کا پانی تو اپنے حال پر قائم رہا لیکن خود پیالے نے مغرب سے مشرق کی طرف زمین کے ساتھ ساتھ زمین کی پوری گردش طے کر لی۔

## قوتِ مقناطیسی کا عجیب و غریب مشاہدہ

غیب و عالم غیب ایک مذہبی اصطلاح ہے جس کا مفہوم مذہبی حدود کے اندر رہا وجود وسیع ہونے کے محدود و غیر واضح ہے لیکن اب کہ دنیا کی تمام علمی ترقیوں کا سر رشتہ عالم غیب ہی میں پنہاں ہے اس کے خطوط زیادہ نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس وقت سائنسی ترقیوں کا انحصار عالم غیب ہی کے رموز و غوامض کے انکشاف پر منحصر ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف جوہری قوت ہی کو لے لیجئے تو معلوم ہوگا کہ عالم غیب کا ایک ایک ذرہ کتنی کائناتی وسعتیں اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔ لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے جو اب تک سائنس کی دسترس سے باہر ہے جیسے نفسیات و ماورا، عالم نفسیات کہنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ ہمارے معتقدین جس چیز کو علم نیرنجات سے تعبیر کرتے تھے وہ بھی اسی کی ابتدائی منزل ہو، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ اس ابتدائی منزل کے مظاہر بھی آج جنہیں ہم شعبدہ و بازی گری کہہ سکتے ہیں، عقل انسانی کی رسائی سے باہر ہیں۔ خود میرا ایک ذاتی مشاہدہ اس باب میں بڑا عجیب و غریب ہے۔

میں رامپور میں ایک طالب علم کی حیثیت سے مقیم ہوں۔ زمانہ ہے نواب حامد علی خاں مرحوم کا امریکہ کا ایک معمر شخص رامپور آنکلتا ہے۔ اور ماہر مسمریزم ہونے کی حیثیت سے اس کی شہرت عام ہو جاتی ہے۔ نواب اس کے فن کے مظاہرہ کی ایک تاریخ مقرر کر کے شہر کے تمام اکابر کو اس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔

نواب مع اپنے تمام سکریٹریوں کے سامنے شہ نشین پر رونق افروز ہیں اور صحن میں دونوں طرف کرسیوں پر معززین بیٹھے ہوئے ہیں، وسط صحن میں ایک چھوٹی سی میز کے سامنے وہ امریکن کرسی کے ایک بازو پر ہاتھ رکھے کھڑا ہے اور ایک پتلا سا آبنوسی ڈنڈا دو ڈھائی فٹ کا اس کے ہاتھ میں ہے نواب اپنے سکریٹریوں سے اس کا تعارف کراتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دو منٹ تک خاموشی کے ساتھ شہ نشین کے بیٹھنے والوں کو دیکھتا ہے اور پھر دفعتاً وہ ہوم سیکریٹری کے پاس جاتا ہے جو نواب کے پہلو میں بیٹھے تھے اور ڈنڈے سے اشارہ کرتے ہوئے ان سے پوچھتا ہے کہ "جناب ہنس کیوں رہے ہیں" اس فقرہ کا ختم ہونا تھا کہ انہوں نے ہنسنا شروع کر دیا لیکن وہ خود خاموش تھا۔ ہوم سکریٹری نہایت سنجیدہ و مہذب انسان تھے لیکن اس کے بعد جو انہوں نے ہنسنا شروع کیا اور ان کی ہنسی اس قدر تیز و بلند ہوتی گئی کہ نواب کو امریکن سے کہنا پڑا کہ اس قصہ کو ختم کیجئے چنانچہ وہ آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ "اب ہنسنا بند کیجئے" اور یہ سنتے ہی وہ پھر سنجیدہ بن کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد اس نے دوسری طرف ایک صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ مجھے بہت غمزدہ نظر آتے ہیں۔ کیا بات ہے، ذرا رو کر دل ہلکا کر لیجئے" اس کا یہ کہنا تھا کہ ان پر رونے کا دورہ پڑ گیا اور اس قدر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے کہ نواب پریشان ہو گئے۔ دس منٹ کے بعد اس امریکن نے یہ کہہ کر کہ "بہت رو چکے اب آنسو پونچھ لیجئے۔ اور آرام کیجئے" انھیں بھی خاموش کر دیا۔ اس کے بعد تیسرا منظر اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھا، اس نے ایک مصاحب خاص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نواب سے کہا کہ "

"یہ شخص تو مجھے کچھ دیوانہ نظر آتا ہے" اور اس نے یہ سنتے ہی اپنے کپڑے پھاڑنا شروع کئے۔ اور پاگلوں کی طرح خدا جانے کیا کیا بکنے لگا۔

اس کے بعد کئی ہفتے اس کا قیام رامپور میں رہا اور محل کے اندر اس نے اپنی مقناطیسی قوت کے بہت سے کرشمے دکھائے۔ جن کو میں نے نہیں دیکھا لیکن سنا ہے کہ ان میں سب سے زیادہ عجیب و غریب مظاہرہ جس نے سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا یہ تھا کہ وہ بجھے بجلی کے قمقموں کو صرف ڈنڈے کے اشارے سے روشن کر دیتا تھا۔

(جنگ کراچی)

# تخلیق آدم

## (ہنڈرک وان لون کے نقطۂ نظر سے)

سرفراز نیازی

ہم ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کے سایہ میں جی رہے ہیں۔

ہم کون ہیں۔ ؟

ہم کہاں سے آئے ہیں۔ ؟

ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ؟

اب آہستہ آہستہ اس سوالیہ نشان کو پیچھے کی طرف ہٹاتے جائیے۔ یہانتک کہ آپ اس افق تک پہنچ جائیں جہاں آسمان وزمین ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں یہاں پہنچکر آپ کو معلوم ہوگا کہ ماضی بعید میں اب سے اربوں سال پہلے کائنات کا کیا رنگ تھا۔ اور ہم کیونکر وجود میں آئے۔

یہ کرۂ زمین جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ ایک بہت بڑا آتشین کرہ تھا۔ مشتعل دھوئیں کا ایک عظیم الشان کرہ۔ جو باوجود اپنی عظمت کے بھی فضائے عالم میں ایک نہایت حقیر چھوٹے سے نقطہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو ہر وقت گردش میں رہتا تھا اور اربوں سال تک وہ اسی چکر میں مبتلا رہا۔

آخر کار ایک وقت آیا (کب اور کیونکر ہمیں نہیں معلوم) کہ رفتہ رفتہ اس کے اشتعال میں کمی پیدا ہونے لگی اور اس میں کچھ جھریاں سی پڑنے لگیں جنھیں ہم پہاڑ یا چٹانیں کہتے ہیں اس کے بعد جب قدرت آگ سلگانے سے کچھ تھک گئی تو اس نے یہ آگ بجھانے کے لئے پانی برسانا شروع کیا۔ لیکن جس طرح وہ آگ بے پناہ تھی۔ اس طرح پانی کے ان اُبلتے ہوئے دھاروں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پہلے ساری دنیا آگ ہی آگ تھی اور اب وہ پانی ہی پانی ہوگئی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ آگ کے بعد پانی کا یہ کھیل قدرت نے کب تک کھیلا۔ لیکن اس کھیل کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ پہاڑوں اور چٹانوں کے ذرات پانی کے ساتھ ساتھ بہہ نکلے اور بلند پہاڑوں کی وادیوں میں ایک بستر کی طرح وہ چاروں طرف پھیل گئے اس کے بعد بھی جب ایک طویل، بڑا طویل زمانہ گزر گیا۔ اور اس اسٹیج کا تیسرا پردہ اٹھا۔ تو سورج نے بادلوں کا پردہ ہٹا کر افق سے دنیا پر نگاہ ڈالی اور یہ دیکھ کر کہ دنیا اب دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ بڑا حصہ پانی کا اور چھوٹا حصہ خشکی کا تو اس نے سوچا کہ اب عمل تخلیق کو زیادہ التوا میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اس کام کے آغاز کے لئے اس نے پانی کے حصہ کا انتخاب کیا ——— اور آخر کار دفعتاً ایک متحرک سا نقطہ اس میں تیرتا ہوا نظر آیا جو تخلیق انسانی کا سب سے پہلا بنیادی نشان تھا

جسے علمی زبان میں خلیہ (cell) کہتے ہیں۔ یہ تھا پہلا بنیادی نقطہ یا تخم، تخلیق حیات کا، لیکن یہ سوال کہ اس میں حرکت و جنبش کیونکر پیدا ہوئی۔ خود اپنے آپ رینگنے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک منتقل ہونے کی اہلیت اس میں کہاں سے آئی۔ اس کا جواب کوئی بڑے سے بڑا سائنس دان آج تک نہیں دے سکا۔ سوا اس قیاس کے کہ آفتاب کی گرمی کی وجہ سے پانی کے قطروں کے اجزا میں کسی کیمیاوی عمل سے کچھ خمیر سا پیدا ہوا۔ اور اس خمیر میں جان سی پیدا ہوگئی۔ بہر حال یہ معمہ کہ حیات یا جان کیونکر پیدا ہوئی، وہ کون تھا جس نے زندگی کا یہ پہلا بیج پانی میں بویا۔ آج تک حل نہیں ہو سکا اور نہ غالباً آئندہ حل ہو سکے گا۔ بہر حال یہ بات کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا ہے تسلیم شدہ امر ہے جس کی تصدیق قرآن کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ (کلّ شیءٍ حیّ من الماء (یعنی ہر شے کی زندگی کی بنیاد پانی ہے) لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ زندگی کا جو یہ حقیر سا بیج بویا گیا تھا وہ دفعتاً نشو و نما پاکر تناور درخت بن گیا اور دنیا آناً فاناً آباد ہوگئی۔ "اس قطرہ کی گہر ہونے تک" کی داستان اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ آپ نے اس خلیہ (cell) کے پیدا ہونے کا حال تو جان لیا۔ لیکن بعد کو اس غریب پر کیا کیا گزری۔ یہ بڑی طویل کہانی ہے۔ کروڑوں سال کا قصہ ہے اور نہایت عجیب و غریب! چاہئے تو یہ تھا کہ یہ خلیہ جلد جلد بڑھتا اور نشو و نما پاکر کوئی دوسری صورت اختیار کر لیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ خلیے ایک طویل زمانۂ نامعلوم تک بے اختیارانہ بغیر قصد و ارادہ کے پانی کے دھاروں اور موجوں کے نشیب و فراز میں ہچکولے کھاتے رہے اور جب وہ اپنی اس زندگی سے تنگ آ گئے تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں ایک جگہ جم کر بیٹھ جانا چاہئے اور اس جستجو میں وہ پانی کی سطح سے بہت نیچے سمندروں کی گہرائی میں پہنچ گئے۔ یہاں پہنچکر انھوں نے کچھ سکون محسوس کیا، اور اپنے آپ کو ڈانوا ڈول زندگی سے محفوظ رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں نکالے۔ لیکن یہ ہاتھ پاؤں ہمارے جیسے نہ تھے بلکہ نہایت باریک ریشوں کی طرح تھے جو سمندر کی تہہ میں زمین کے اندر پھیلنے لگے اور ان کے سہارے ایک جگہ ملکر انھوں نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ اور اس طرح سب سے پہلے پانی کے اندر کی جھاڑیوں یا سمندر کے پودے وجود میں آئے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ تمام خلیوں نے یہی عمل اختیار کیا۔ درست نہیں کیونکہ ان میں لاتعداد خلیے ایسے بھی تھے جنھوں نے آبی پودوں کی سی غیر متحرک زندگی کو پسند نہیں کیا اور ان کے ریشوں نے ننھے ننھے پاؤں کی صورت اختیار کر لی۔ جن کی مدد سے وہ آبی پودوں کے ارد گرد حرکت کرنے لگے اور کیڑے مکوڑے کہلائے۔ ان میں سے بعض ایسے خلیے بھی تھے۔ جن کے ریشوں نے پاؤں کی جگہ بازوؤں کی صورت اختیار کر لی۔ اور ان کی مدد سے وہ پانی میں ادھر اُدھر تیرنے لگے۔ یہی تھے وہ خلیے جو بعد کو ترقی کرتے کرتے مچھلیاں بن گئے۔ الغرض اس طرح سمندر کی آبادی بڑھنے لگی اور کروڑوں سال تک اس طرح بڑھتی رہی۔

اس کے بعد ارتقار کی دوسری منزل شروع ہوئی۔ یعنی پانی کے پودوں اور درختوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ وہ سمندر کی آبی فضا سے نکل کر ذرا باہر کی بھی سیر کریں اور اس طرح وہ بڑھتے بڑھتے ساحل آب کی ان دلدلوں تک پہنچ گئے جو سمندروں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ لیکن اب ایک سب سے بڑی مشکل ان کے سامنے آئی اس سے پہلے تو انھیں صرف پانی کے اندر ہی زندہ رہنے اور نشو و نما پانے کا سلیقہ حاصل تھا اور پانی ہی کے اندر اپنی غذا حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن دلدلوں اور ساحلوں میں پانی کہاں۔ اس لئے انھوں نے رفتہ رفتہ ہوا سے اپنی غذا حاصل کرنا شروع کی اور سیکڑوں صدیاں گزرنے کے بعد وہ اس نئی زندگی سے اس قدر مانوس ہوئے کہ اپنی ایک نئی دنیا بسالی۔ وہ رفتہ رفتہ پھول پیدا کرنے لگے اور ان پھولوں کے ذریعے جڑیوں کے ذریعے سے اتنے پھیل گئے کہ کوہ دامن ہر جگہ پیڑ ہی پیڑ نظر آنے لگے۔

اب اسی کے ساتھ پانی کی اس دوسری مخلوق کو بھی لیجئے جسے ہم مچھلی کہتے ہیں کہ ان میں سے بھی بعض نے پانی کے اندر رہنے پر قناعت نہیں کی، اور خشکی کی سیر کرنے کی بھی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہوا میں سانس لینے کے لئے انھوں نے گلپھڑے بھی پیدا کر لئے تاکہ وہ پانی اور خشکی دونوں جگہ زندگی بسر کرسکیں۔ جسکی سب سے پہلی مثال مینڈک ہے کہ اس کا مسکن پانی بھی ہے اور خشکی بھی۔

اس آبی مخلوق میں بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے ایک بار خشکی پر آنے کے بعد پانی میں واپس جانا پسند نہیں کیا۔ سو یہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ نے رینگنے والے جانوروں کی شکل اختیار کرلی جو ریڑھ کی ہڈی رکھتے تھے اور جب ان کے پاؤں لگ گئے تو رفتہ رفتہ انھوں نے عجیب وغریب مہیب اور عظیم الشان صورتیں اختیار کرلیں۔ یہاں تک کہ زمین کا بڑا حصہ ان سے بھر گیا۔ دوسرا حصہ کیڑے مکوڑوں کی صورت میں درختوں پر چڑھ گیا اور ایک شاخ سے دوسری شاخ تک رینگ رینگ کر پہنچنے لگا، لیکن پھر اس کے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ شاخوں سے الگ ہو کر فضا کی بھی سیر کرے تو اس کے پہلو میں دونوں طرف دو پر پیدا ہو گئے اور وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ اس کے بعد عالم مخلوقات میں تیسرا انقلاب آیا۔ یعنی تمام بڑے بڑے جانور ہلاک ہونے لگے شاید اس لئے کہ انھیں دنیا کی ہوا راس نہیں آئی، یا اس لئے کہ وہ نہ تیر سکتے تھے، نہ اُڑ سکتے تھے نہ تیز دوڑ کر اپنی غذا حاصل کرسکتے تھے۔ بہرحال وہ رفتہ رفتہ ختم ہوگئے اور ان کی جگہ ایک بالکل نئی مخلوق نے لے لی۔ جو نہ مچھلیوں کی سے بازو رکھتی تھی۔ نہ چڑیوں کی طرح پر یعنی تھی تو وہ انھیں رینگنے والی مخلوق کی نسل سے جس میں نر و مادہ کو تفریق ہو چکی تھی۔ لیکن اب قدرت نے اس کی زندگی کا اسلوب بدل دیا تھا۔ پہلے تو یہ مخلوق صرف انڈے دیتی تھی اور ان سے بچے پیدا ہو کر از خود اپنی غذا تلاش کر لیتے تھے۔ لیکن اب بچوں کی پیدائش انڈوں کی جگہ مادہ کے پیٹ سے ہونے لگی اور بچوں کی پرورش کیلئے ان کو تھن دیدئے جس سے دودھ پیدا ہوتا تھا اور اسی دودھ سے بچوں کا نشو و نما ہوتا تھا۔

قدرت کی یہ تخلیق کب ہوئی اس کا حال کسی کو معلوم نہیں لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس تفریق کے بھی دو پہلو تھے۔ یعنی ایک وہ مخلوق یا حیوانات جو دماغ تو رکھتے تھے لیکن تعقل سے بیگانہ تھے اور وہ صرف اس حد تک سمجھ سکتے تھے کہ اپنی حفاظت اور فراہمی غذا کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ یعنی اپنی بقا کے لئے ایک فطری احساس ان میں ضرور موجود تھا۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن اس کی دوسری قسم اس مخلوق کی وہ تھی جو تعقل بھی رکھتی تھی اور جو اس بات کے سمجھنے کی بھی قطعی صلاحیت رکھتی تھی کہ وہ اپنے بقا و تحفظ کے لئے خارجی تدابیر بھی اختیار کرے اور یہی تھی وہ مخلوق جسے ہم آدم کہتے ہیں اور جس نے اپنی عقل منطقی سے کام لے کر ترقی شروع کی اور رفتہ رفتہ تمام روئے زمین پر چھا گئی۔


**نظیر نمبر**

(نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ) جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک۔ اس کا فارسی و اردو کلام میں عارفانہ رنگ، اس کی قدرت زبان و بیان، اس کا معیاری تغزل۔ ادبیات اردو میں اس کا فنی و لسانی درجہ، اس کے امتیازات و محاسن شعری۔ اس کا شاعری میں مقام۔ صناع و طباع شعراء کا فرق۔ معاصرین کی رائیں۔ مستند ادبار کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اسی کی خصوصیت و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔

قیمت :۔ تین روپے

**نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳**

# باب المراسلہ والمناظرہ

## (بعض آیات قرآنی)

(مولانا عرشی دار القرآن - لاهور)

مخدومی مولانا! اسلام و رحمت

آپ نے نگار اکتوبر ۱۹۶۳ء میں میرا عریضہ شائع کر کے اور اس پر اپنے قلم سے چند سطور لکھ کر مجھے مطمئن کر دیا اور اسکے ساتھ ہی اپنی عظمت میں بہترین اضافہ کیا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

حدیث "الحرب خدعة" پر جو کچھ آپ لکھ چکے ہیں میرا خیال ہے وہ کافی وشافی ہے۔ آیات ذیل سے متعلق آپ کی تحقیق کا مشتاق و منتظر ہوں۔

۱۔ ان المنافقین یخادعون اللہ وھو خادعھم (نساء ع ۲۱)

۲۔ واللہ خیر الماکرین (آل عمران ع ۵ و انفال ع ۴)

۳۔ انھم یکیدون کیدا واکید کیدا (طارق ع ۱)

۴۔ املی لھم ان کیدی متین (اعراف ع ۲۳ و قلم ع ۲)

۵۔ کذلک کدنا لیوسف (یوسف ع ۹)

۶۔ اللہ یستھزی بھم (بقرہ ع ۲)

اور بھی کئی ایسے مقامات ہیں لیکن ان مختصر آیات کی شرح سے آپ کا نہج فکر معلوم ہو جائے گا جس سے مجھے ایسے طلبہ قرآن کی واقفیت میں اضافہ ہوگا۔

---

(نگار)

آپ ان آیات کی تحقیق مجھ سے چاہتے ہیں! کس قدر عجیب بات ہے۔ میں کیا اور میری تحقیق کیا۔ آپ اپنی ساری زندگی مطالعہ قرآن کے لئے وقف کر چکے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت دار القرآن کا قیام و اجراء ہے اور پہلی ربع صدی میں آپ نے قرآن کی جتنی عظیم خدمت انجام دی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اس لئے مناسب تو یہی تھا کہ "خدعة" کی بحث میں آپ ہی اس موضوع پر مزید گفتگو فرماتے اور اسی سلسلے میں اس کے قریب قریب ہم معنی دوسرے الفاظ "کید" "استہزاء" اور "مکر" وغیرہ

اپنی تحقیق سے سب کو مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ لیکن یہ بارگراں آپ نے میرے سر ڈالدیا۔ غالباً اس لئے کہ اس باب میں اگر میں کسی غلطی میں مبتلا ہوں تو آپ اس کو دور کردیں۔ مناسب ہے۔ بہرحال ازرہ تمثال امر میں یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کررہا ہوں۔

آپ نے جن آیات کا حوالہ دیا ہے۔ ان سب پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کرنا شاید ضروری نہیں۔ مجموعی طور پر ان سب کے مفہوم کو سامنے رکھ کر اظہار خیال غالباً زیادہ مناسب ہوگا۔

وہ آیات قرآنی جن میں خدع، مکر یا کید کو خدا نے اپنی ذات سے منسوب کیا ہے، اس لحاظ سے یقیناً قابل توجہ ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد ایک شخص اعتراض کرسکتا ہے (اور مسیحی جماعتوں نے کیا ہی ہے) کہ مسلمانوں کا خدا خادع بھی ہے، ماکر بھی ہے اور کیاد بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس غلطی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ معترضین نہ الفاظ کی لغوی تحقیق کرتے ہیں نہ آیات قرآنی کے سیاق وسباق (محل استعمال) کو سامنے رکھتے ہیں اور نہ عربی ادب کی خصوصیات بیان پر ان کو وقوف ہے۔ اس لئے میری رائے میں معترضین کے شبہات دور کرنے کے لئے زیادہ بحث ومباحثہ میں پڑنے کے بجائے مناسب یہ ہے کہ انھیں ان الفاظ کے مختلف مفاہیم ومعانی سے آگاہ کردیا جائے۔

مثلاً سورۂ نساء کی اسی آیت کو لیجئے جو آپ نے تحریر فرمائی ہے کہ اس کا ترجمہ اردو میں بظاہر یہی ہوسکتا ہے کہ "منافقین اللہ کو دھوکا دیتے ہیں اور اللہ انھیں دھوکا دیتا ہے" اور اس ترجمہ یا مفہوم کی بنا پر ایک شخص بہ آسانی کہہ سکتا ہے کہ خدا (نعوذ باللہ) خود بھی دھوکا باز ہے۔ لیکن اگر لغوی حیثیت سے اس کے تمام معانی ظاہر کردیے جائیں تو وہ ترجمہ صحیح نہ رہے گا جو میں نے ابھی کیا اور مفہوم بالکل دوسرا ہوجائے گا۔

لفظ "خدع" فعل لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ پہلی صورت میں اس کے معنی صرف "فاسد" ہوجانے کے ہیں اور جب کسی شے میں کوئی تغیر پیدا ہوجاتا ہے تو کہتے ہیں "خدع الشئ" یعنی "وہ کچھ سے کچھ ہوگئی" (یہ معنی بھی میں نے ڈرتے ڈرتے کئے ہیں ورنہ خود لفظ "فساد" اتنے متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے کہ ان کا اظہار بھی بڑی تفصیل چاہتا ہے لیکن خیر بات کو مختصر کرنے کے لئے میں نے اسی معنی پر اکتفا کیا) خدع کا مفہوم فعل متعدی ہونے کی صورت سے اور زیادہ وسیع ہے۔ مثلاً اس کا ایک مفہوم ہے "کسی کو دھوکا دینا یا نقصان پہنچانا ایسے ذرایع سے جن کا علم دھوکا دیے جانے والے کو بالکل نہ ہو"۔ "خدع" کا ایک مفہوم ترک کردینا اور چھوڑ دینا بھی ہے جیسے "کان فلاناً یعطی ثم خدع" (یعنی وہ پہلے بخشش کیا کرتا تھا لیکن پھر یہ عادت ترک کردی)

اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے "دل کی بات چھپا کر اس کے خلاف باور کرانے کی کوشش کرنا" اور یہی مفہوم مکر وکید کا بھی ہے۔ اسی مفہوم کے قریب قریب جو اور تفریعی معانی اس لفظ کے پیدا ہوتے ہیں وہ عربی زبان کے مختلف محاورں کے مطالعہ سے بہ آسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ مثلاً جب بازار کا بھاؤ گھٹتا بڑھتا ہے تو کہتے ہیں "سوق خادعۃ" یا جب کوئی پوری طرح کسی چیز کو نہ دیکھ سکے تو کہتے ہیں "خادع العین" (آنکھ کو دھوکے میں مبتلا کردیا) جب ریگستان میں راستہ بن بن کر بگڑ جاتے ہے تو اسے "طریق خادع" یا "طریق خدوع" کہتے ہیں۔ اسی طرح کھوٹے سکے کو دینار خادع (دھوکا یا مکر وفریب کے مفہوم سے متفرع ہے۔

اس لفظ کے مفہوم کا ایک پہلو اور ہے جو غالباً زیر بحث گفتگو سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور وہ ہے دھوکے کی

کامیابی یا ناکامی کا۔ سو اہل عرب نے اس کی تفریق بھی کر دی ہے اور وہ یہ کہ اگر دھوکا دینے والا کامیاب ہو جائے تو کہیں گے "ھو خَدَع" یعنی وہ دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن وہ اگر کامیاب نہ ہوگا اور اقدام ناکام ہوگا۔ (جس کا اشارہ کلام مجید کی اس آیت میں بھی موجود ہے۔ "یخادعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون الا انفسھم") تو کہیں گے "ھو خادع" اور میں سمجھتا ہوں کہ کلام مجید میں جہاں جہاں دوسروں کے لئے "یخادعون اللہ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان کا مفہوم یہی ناکام مکر و فریب ہے۔ اور جہاں جہاں خدا نے اس لفظ کا انتساب اپنی ذات سے کیا ہے وہاں اس کا مفہوم ہوگا دھوکے کو ناکام بنا دینا اور مخالف تدبیروں سے پلٹ دینا"

اس طرح اس قسم کی تمام آیات کا مفہوم یہ قرار پائے گا کہ "مخالفین دھوکا دینے، مکر و فریب سے کام لینے کی کوشش تو ضرور کرتے ہیں لیکن خدا ان کی ہر سعی و کوشش کو ناکام بنا دیتا ہے۔" اور یہ وہ مفہوم ہے جو لغت، محاورہ سیاق و سباق ہر لحاظ سے صحیح ہے اور جس کے پیش نظر یہ اعتراض بالکل دور ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کا خدا خود اپنے آپ کو خادع۔ مکار یا کیاد ظاہر کرتا ہے۔

بہ سلسلۂ لفظ مکر، آل عمران کی جس آیت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ یہودیوں سے متعلق ہے کہ انھوں نے مسیح کو ہلاک کرنے کی تدابیر اختیار کیں اور اللہ نے مسیح کو بچانے کے لئے زیادہ بہتر تدبیر اختیار کی کیونکہ مکر کے معنی تدبیر کے بھی ہیں۔

سورۂ انفال میں مکر کا ذکر واقعۂ ہجرت کے سلسلے میں کیا گیا ہے اور اس میں یمکرون کا مفہوم ہے سازش۔ اور مکر کا مفہوم ہے دفع سازش۔

اسی طرح سورۂ طارق اور سورۂ یوسف کی جن آیات کا ذکر آپ نے کیا ہے ان میں لفظ کید چارہ و تدبیر کے مفہوم میں مستعمل ہوا ہے۔ چنانچہ کادالشئ کے معنی "عالجہ" کے جاتے ہیں۔

---

اب رہا "اللہ یستھزی بھم" سو اس کی صورت بھی بالکل یہی ہے۔ منافقین کہتے ہیں "انما نحن مستھزؤن" (یعنی ہم تو مسلمانوں کا ٹھٹھا اڑاتے ہیں، ان کی توہین کرتے ہیں) اور خدا اس کے جواب میں کہتا ہے "اللہ یستھزی بھم" یعنی خدا انھیں اس کی سزا دے گا کیونکہ "استہزاء" کا مادہ "ہزا" ہے اور اس کے معنی ہلاک کرنے کے بھی ہیں۔ چنانچہ سردی کی شدت سے کوئی شخص ہلاک ہو جاتا ہے تو اہل عرب کہتے ہیں "اہزاہ البرد" (سردی نے اسے مار ڈالا)

میں نے لغوی تحقیق کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا ہے۔ وہ آپ کے لئے نہیں ہے کیونکہ یہ سب کچھ یقیناً پہلے ہی سے آپ کے ذہن میں ہوگا بلکہ ان حضرات کے لئے ہے جنھیں ان مسائل پر غور کرنے کی فرصت نہیں۔

آخر میں خدا کے اسماء صفاتی کے سلسلہ میں (جس کا اشارہ آپ نے اکتوبر کے نگار میں کیا تھا اور خادع کو خدا کا اسم صفت قرار دیا تھا) صرف اس قدر عرض کروں گا کہ اگر قرآن کے ہر لفظ کو سامنے رکھ کر خدا کا اسم صفاتی قائم کرنے کی اجازت آپ نے دیدی تو ایک شخص کو یہ کہنے کا بھی حق حاصل ہو جائے گا کہ آیات زیر بحث کے پیش نظر وہ اسماء حسنیٰ میں المکار۔ الکیاد اور المستھزی کا بھی اضافہ کر دے۔

خود میرا ذاتی خیال اس باب میں کچھ اور ہے یعنی یہ کہ خدا کے اسماء صفاتی متعین کر کے اس کی ذات کو محدود کر دینا ہے۔ خدا بے نام ہے اور اسے بے نام ہی رہنا چاہیے۔ لفظ اللہ بھی میرے نزدیک خدا کا نام نہیں بلکہ وہ محض ایک Symbol

رمز یہ اشارہ ہے جو ہمارے ذہن کو مخصوص تصور کی طرف مائل کر دیتا ہے۔

عام طور پر جو اسمار حسنیٰ بتائے جاتے ہیں وہ بھی دراصل محض ناقص تعبیرات ہیں خود اپنے ہی تصور و خیال کی ان سے حقیقت خداوندی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تاہم ان میں ایک تعبیر ایسی ہے جسے فلسفۂ الٰہیات میں جگہ دی جاسکتی ہے اور وہ ہے "ہوالکل" بعض حضرات "ہوالاول" "ہوالآخر" ہوالظاہر، ہوالباطن کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، لیکن میرے نزدیک اس میں بھی اول و آخر، ظاہر و باطن کہہ کر تحدید کر دی گئی ہے۔ اللہ کو "ہوالغالب" کہنا بھی قابلِ قبول ہے۔ لیکن جبار۔ قہار وغیرہ میرے حلق سے نیچے نہیں اُترتے۔ بہر حال اس باب میں کوئی کچھ بھی کہے اور وجود خداوندی کی حقیقت سمجھانے کے لئے کتنے ہی الفاظ کیوں نہ وضع کرے لیکن آخر کار بیدلؔ کی طرح اس اعتراف کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ :۔

بیدل آں گوہر نایاب سراغ — بہ محیطے ست کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ در آئینۂ ہوش — گل تواں گفت و لے چیدن نیست
نسخہا در بغل و فہم محال — جلوہا در نظر و دیدن نیست

اور ہزاراں ہزار صلوات بروحِ پاکِ عرفی، جو بیدل سے بھی آگے بڑھ کر اپنے جذبۂ نارسائی کو اس طرح ظاہر کرتا ہے

کنہہ ذاتِ تو بہ ادراک نشاید دانست
وایں سخن نیز باندازۂ ادراک من ست

یعنی میں جانتا ہوں کہ تجھے ہم اپنے ادراک سے نہیں جان سکتے لیکن میرا یہ کہنا بھی اپنے ہی اندازۂ ادراک کے لحاظ سے ہے۔ اور ہمارا اعتراف نارسائی بھی حد درجہ نارسا ہے۔

---

## (۲)

ڈاکٹر سید محمد یوسف (صدر شعبہ عربی - کراچی یونیورسٹی)

اگست کے شمارے میں میرے فاضل دوست ڈاکٹر سبزواری کا مقالہ بعنوان، "کچھ (ایسا) کے بارے میں" پیش نظر ہے۔ موصوف کی علمی تحقیق کے ذیل میں ایک عام لسانی دلچسپی رکھنے والے کی حیثیت سے "ایسا"۔ "جیسا" کے اجزار اصلیہ کی بابت عرض ہے :۔

ملاحظہ ہو :۔

یوں (ی / وں) = ایسا (ا - ی / سا)
جوں (ج / وں) = جیسا (ج - ی / سا)
توں (ت / وں) = تیسا (ت ی / سا)
کیوں (ک - ی / وں) = کیسا (ک - ی / سا)
ویسا (و - ی / سا)

دوسرے جزو "سا" کی بابت ڈاکٹر سبزداری بہتر بتائیں گے کہ تازہ درایت ہے یا قدیم سے ہندی جنسیت کا حامل ہے۔ پہلے جزو کی بابت کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

ا ۔ دیکھئے :۔ اب ، ادھر (قدیم : ایدھر) ؛ اس ؛ ان ۔ [یہاں]

ج ۔ " :۔ جب ، جدھر ؛ جس ؛ جن ۔ جہاں ۔

ت ۔ " :۔ تک ، "ت" برائے جواب و مشاکلت :۔

[قب (مخفف "مقابلہ کیجئے") :۔ جوں کا توں ؛ جیسا کا تیسا ؛

ایسی کی تیسی ۔ ایضاً ؛ جوں توں ؛ جیسے تیسے ۔]

ک ۔ دیکھئے :۔ کب ؛ کدھر ؛ کس ، کن ۔ کیا (ک ۔ ی / ا) ۔ کہاں ۔

د ۔ " :۔ اُدھر ، اُس ؛ اُن وہاں ۔

مندرجہ بالا شواہد میں حرکت کی تبدیلی اور واؤ اور یا کا ظاہر یا ستتر ہونا نطق و صورت کے اصول کے عین مطابق ہے۔

زور بیان کا نازک فرق جس کی طرف مدیر نگار نے اپنی تعقیب میں اشارہ کیا ہے اس سے "لیس کمثلہ شیٔ" کا نکتہ تازہ ہو گیا۔

---

(۲) خاتمہ میں سخن گسترانہ ایک بات اور۔ اسی شمارہ میں نیاز صاحب نے نگار کا آئندہ لائحہ عمل پیش کرتے ہوئے جو یہ فرمایا ہے کہ :۔

"ادبیات کے سلسلے میں دو چیزوں کا اضافہ اور بھی میرے پیش نظر ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں میں فارسی و عربی ذوق پیدا کیا جائے۔ نہ صرف اس لئے کہ ان کے جانے بغیر کوئی شخص صحیح اردو نہیں لکھ سکتا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ یہ دونوں زبانیں ان مسلم ممالک کی ہیں جن کے جذبات کا مطالعہ ہر مسلمان کا اجتماعی فرض ہے۔ دوسرے یہ کہ شعراء کو فن کی آگاہی کی طرف مائل کرنے کے لئے "مسائل عروض" پر بھی گاہ گاہ مضامین شائع کرنا ضروری ہے ......"

یہ بہت اہم ہے۔ پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر نیاز صاحب نے اس طرف خصوصی توجہ کی تو وہ سب سے بڑی خدمت انجام دیں گے۔

اردو ادیبوں کی وہ نسل جو عربی فارسی کو اپنا سرمایہ سمجھتی تھی اب ختم ہونے کو ہے انگریزی داں اردو ادیبوں کا دور دورہ شروع ہو گیا ہے۔ یہی وقت اردو کو سنبھالا دینے کا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ نہ صرف اردو بلکہ اسلام اور اسلامی علوم بھی عربی سے آزاد ہو چکے ہیں۔ یہ اس پاک سرزمین کا بیک وقت دینی اور ادبی کارنامہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہے۔ یہ نصف حقیقت ہے۔ پوری حقیقت غیر شعوری طور پر کچھ لوگ یوں کہہ جاتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے۔ اتنا عرصہ گزر گیا نام ہی نام ہے۔ دائیں سے بائیں تک نظر دوڑا جائیے اس نام سے کام نکالنے میں کوئی کسی سے پیچھے نہیں۔ عام فضا کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ اسلام کا مفکر بھی یہاں آکر غلاف کعبہ۔ بلکہ غلاف برائے کعبہ۔ کا مجاور بن جاتا ہے۔ ایک زمانہ میں یاروں کو عربی کی بھی سوجھی تھی۔ اس غریب کے نام سے بھی کتنوں کے کام نکلے۔ کانفرنسیں ہوئیں کہ عربی کو پاکستان کی قومی زبان بنا دیا جائے۔ اخباروں کے ذریعہ شور مچایا گیا کہ پاکستان کے وزراء بڑے ذوق و شوق سے عربی سیکھ رہے ہیں۔ میں ان دنوں قاہرہ میں تھا۔ پاکستانی سفارت والے (جن میں سے کسی نے عربی سیکھنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ ہندوستانی سفارت کے عملہ مرد و زن نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے انہماک سے اچھی خاصی عربی بول چال کی مہارت پیدا کرلی تھی) ان خبروں کو بڑے اہتمام کے ساتھ انگریزی میں مصری دوستوں اور اخباری نمائندوں کو سناتے۔ اگر کبھی ان میں سے کوئی مصری میری طرف متوجہ ہوکر تصدیق چاہتا اور میں جھوٹ بولنے سے اعتراض کرتا تو پاکستانی دوست برہم ہوتے اور میرے متعلق طرح طرح کی بدگمانیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔

اسلام کے بعد دوسرا نمبر اردو کا ہے۔ ابھی تک تو یہ تھا کہ چند فرزانے دیوانے اپنی دھن میں لگے رہتے۔ کام کرتے اور کبھی کبھی امیدوں کا ماتم کرلیتے۔ اب ہر بوالہوس اردو پرستی شعار کر رہا ہے۔ یہ اردو پرستی ویسی ہی ہے جیسے قوالی۔ نہ اس سے دین کی خدمت ہوسکتی ہے نہ اس سے زبان و ادب کی اور پھر وہی سوال کہ کیا فارسی کے علمی ذوق کے بغیر اردو کی کوئی قابل قدر ادبی خدمت ممکن ہے؟

---

(نگار) مکتوب گرامی کے حصہ اول کی داد تو جناب ڈاکٹر سبزواری دیں گے۔ لیکن دوسرے حصہ کا شکریہ بیشک میرے ذمہ ہے جس کا اظہار ایک التجا کی صورت میں صرف اس طرح مناسب ہوگا کہ:-

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشہ بما رسد

# باب الاستفسار

## جبر و اختیار

### محمد یامین خاں۔ بجنور

کچھ دنوں سے جبر و اختیار کا موضوع زیر فکر ہے۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے ذہن کچھ مندرجہ ذیل خطوط پر کام کرتا ہے۔

(۱) ذہن کے بنیادی نقوش بچہ ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جو اختیاری چیز نہیں۔ زندگی میں پیش آنے والے حوادث و حالات کی نوعیت اور تربیت بھی اس کے اختیار میں نہیں۔ لہٰذا ذہن پر حوادث و حالات کا رد عمل بھی غیر اختیاری چیز ہوئی اور اسی رد عمل کا نام فعل ہے۔ اس لئے انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہیں۔

مثال کے طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ انسان ایک دھات کے گھنٹے کی طرح ہے۔ جس کو بنانے والے نے ایک خاص قسم کی دھات سے بنا دیا ہے۔ اس پر مختلف ہتوڑیوں سے ضرب لگنے پر جو آوازیں نکلتی ہیں اُن کا ذمہ دار وہ گھنٹہ نہیں بلکہ وہ دھات جس سے وہ بنایا گیا ہے یا ہتوڑی اور ہتوڑی کی ضربوں کی قسم۔ ترتیب۔ مقام اور شدت ہوں گے۔

(۲) اگر انسان با اختیار ہے تو تقدیر کوئی چیز نہیں۔ مستقبل کے کسی فعل کی پیش گوئی کرنا ناممکن ہے بجز آنکہ

(ا) فاعل کی باگ ڈور خود پیش گوئی کرنے والے کے ہاتھ میں ہو۔ یا

(ب) کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔ جس کے بارے میں مکمل اور یقینی علم پیش گوئی کرنے والے کو ہو جیسے گھڑی۔ اگرچہ میں نے نہیں بنائی لیکن مجھے یقینی علم ہے کہ بنانے والے نے ایک خاص میکنزم اس کا رکھا ہے جس کی وجہ سے اس کی ہر ہر حرکت متعین ہے اس لئے میں پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ یہ نو کے بعد دس ہی بجائے گی۔ آٹھ نہیں۔

میری طالب علمانہ آرزو ہے کہ اس موضوع پر میری فہم کے مطابق جناب والا کچھ اظہار خیال فرمائیں۔

---

(نگار) یہ سوال اس سے قبل بھی بارہا مجھ سے کیا گیا ہے اور میں اس کا جواب بھی مفصل دے چکا ہوں۔ اس کا اعادہ پھر کرتا ہوں یہ نزاع کہ انسان مجبور ہے یا مختار نہایت قدیم ہے اور دفتر کے دفتر اس مسئلہ پر سیاہ ہو چکے ہیں۔ لیکن آپ یقین کیجیے کہ اس باب میں ایک لمحہ کے لئے بھی کسی غیر معمولی پیچیدگی کا خیال میرے دل میں نہیں آیا اور یہ مسئلہ مجھے نہایت صاف و روشن نظر آتا ہے۔

یقیناً قرآن حکیم میں ایسی آیات موجود ہیں جن میں باہم تناقض و تضاد نظر آتا ہے۔ یعنی بعض آیات سے انسان کا مجبور ہونا ہے اور بعض سے مختار ہونا ظاہر ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ تضاد باقی نہیں رہتا اور حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔

مجبوری کے ثبوت میں متعدد آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں مثلاً۔

(۱) ولا تتحرك ذرة الا باذن الله

(۲) يفعل ما يشاء

(۳) يضل الله من يشاء ويهدى من يشاء

(۴) وما كان لنفس ان تؤمن الا باذن الله

(۵) ولو شاء الله ما اشركو

(۶) من يهدى الله فهو المهتد ومن يضلله فلن تجد له وليا مرشدا

(۷) فمنهم من هدى الله ومنهم من حقت عليه الضلالة وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اس کے ساتھ قرآن حکیم میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کہ

لا يرضى لعباده الكفر اور واتبعوا ما اسخط الله وكرهوا رضوانه فاحبط اعمالهم

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ جس وقت فطرت انسانی پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان جمادات کی طرح بے حس نہیں پیدا کیا گیا بلکہ وہ ارادہ کرتا ہے۔ ارادہ کے ماتحت اپنے جوارح سے کام لیتا ہے جس کام کو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نہیں کرتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ قوت ارادی کس نے عطا کی؟ ظاہر ہے کہ خدا نے اس کی فطرت و پیدائش میں یہ صلاحیت یا قوت رکھدی ہے اور اسی قوت سے کام لے کر ایک ارادہ کرتا ہے اور اس سے باز رہ سکتا ہے۔ اسی طرح انسان میں دو متضاد خواہشوں کے پیدا ہونے کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے۔ اور انھیں خواہشوں کے مطابق وہ کبھی اچھے کام کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی بُرے کام کی طرف۔ چنانچہ خود خدا ارشاد فرماتا ہے۔

قد افلح من زكها وقد خاب من دسها۔

(یعنی کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کو پاک کیا اور خسارہ میں رہا وہ جس نے اسے آلودہ کیا)

پھر چونکہ ان قوتوں کا پیدا کرنے والا خدا ہے اس لئے اگر وہ تمام درمیانی واسطوں اور اسباب کو قطع نظر کرکے یوں کہے کہ جو کچھ چاہتا ہوں میں ہی کرتا ہوں یا بغیر میرے ارادہ و اذن کے کچھ نہیں ہو سکتا، تو غلط نہیں کیونکہ اگر وہ ہمارے اندر کسی کام کی قوت پیدا نہ کرتا تو ہم سے وہ کام کسی طرح نہ ہو سکتا تھا۔

اس مسئلہ میں سب سے بڑی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ تقدیر کے مفہوم پر صحیح غور نہیں کیا جاتا۔ عام طور سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر کام

ہر واقعہ اور ہر حادثہ اور ہر بات کے لئے جداگانہ مشیت ہوا کرتی ہے۔ یعنی اگر اس وقت ہم اُٹھ کر کہیں جاتے ہیں تو اس وقت خدا کی مشیت ایسی ہوئی ہے یا یہ کہ خدا نے پہلے سے معین کر دیا ہے کہ فلاں فلاں بات فلاں وقت فلاں انسان سے سرزد ہوگی۔ لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں۔ مشیت ایزدی کا ظہور حقیقتاً اس فطرت میں ہوتا ہے جس پر انسان یا دیگر موجودات عالم پیدا کئے گئے ہیں۔ جس طرح پتھر کا بھاری ہونا۔ آگ کا جلانا۔ مقناطیس کا جذب۔ لوہے کا انجذاب یہ سب مقدراتِ الٰہیہ ہیں۔ اسی طرح ارادۂ انسانی بھی ایک مقدر ہے جس کی بناء پر ہم ایک کام کو کرتے ہیں اور دوسرے سے بچتے ہیں۔ ہاں اللہ کو اس کا علم ضرور ہے کہ اس کے بندوں سے یہ حرکت سرزد ہوگی لیکن اس کا علم مجبور کرنے والا نہیں۔ اس باب میں جناب عبداللہ بن عمر کا قول قابلِ غور ہے۔ ملل و نحل میں لکھا ہے کہ:-

"ایک شخص عبداللہ بن عمر کے پاس آیا اور کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن، بعض لوگ زنا کرتے ہیں شراب پیتے ہیں چوری کرتے ہیں۔ قتل کے مرتکب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے علم میں تھا۔ ہم اس پر مجبور تھے۔"

آپ یہ سن کر برہم ہوئے اور فرمایا۔ "سبحان اللہ العظیم قد کان ذلک فی علمہ انہم یفعلونہا لم یحملہم علم اللہ علیٰ فعلہا۔"

(یعنی بیشک خدا کے علم میں تھا کہ وہ ایسا کام کریں گے لیکن خدا کے علم نے انھیں ان کاموں کے کرنے پر مجبور تو نہیں کیا)

اس کے بعد آپ نے بروایت حضرت عمر رسول اللہؐ کی یہ حدیث پڑھی کہ:-

"مثل علم اللہ فیکم کمثل السماء اللتی اظلتکم والارض اللذی اقلتکم فکما لا تستطعون الخروج من السماء والارض کذلک لا تستطیعون الخروج من علم اللہ وکما لا تحملکم الارض والسماء علی الذنوب کذالک لا یحملکم علم اللہ علیہا۔"

(یعنی علم الٰہی کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آسمان جس نے تم پر سایہ کر رکھا ہے اور زمین جس نے تمھیں اٹھا رکھا ہے۔ پس جس طرح تم آسمان و زمین سے نکل کر باہر نہیں جا سکتے اسی طرح علم الٰہی سے باہر نہیں ہو سکتے۔ لیکن جس طرح آسمان و زمین تمھیں گناہ پر مجبور نہیں کرتے اسی طرح خدا کا علم بھی تمھیں گناہ پر مجبور نہیں کرتا)

غالباً اس سے بہتر مثال خدا کے علم کی اور کوئی نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے زیادہ صاف بیان مسئلہ جبر و اختیار میں اور کوئی ہو سکتا ہے۔ چونکہ یہ خود رسول اللہؐ کا ارشاد ہے اس لئے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی لیکن ہم اس پر اکتفا نہیں کرتے اور بعض صحابۂ کرام اور اکابر امت کے اقوال بھی اس باب میں پیش کرتے ہیں جس سے اس کی اور زیادہ وضاحت ہو جائے گی۔

جب حضرت علی جنگ صفین سے لوٹے تو ایک شخص آپ کے پاس آیا اور بولا کہ "ہمارا شام کی طرف سفر کرنا کیا قضا و قدر کے موافق تھا" آپ نے جواب دیا کہ "قسم ہے دانہ کو پھوڑنے والے اور جان کے پیدا کرنے والے کی کہ نہیں اُترے ہم کسی وادی میں اور نہیں چڑھے ہم کسی بلندی پر مگر موافق قضا و قدر کے" اس شخص نے کہا کہ "تو پھر ہمیں کوئی ثواب بھی نہیں ملا؟" حضرت علی نے یہ سن کر فرمایا کہ:-

لعلک تظن قضاء واجباً وقدراً حتماً ولو کان کذالک لبطل الثواب والعقاب ولسقط الوعد والوعید وبما کانت تاتی من اللہ لائمۃ اللذنب ولا محمدۃ للمحسن تلک مقالتہ اخوان الشیاطین وعبدۃ الاوثان وخصماء الرحمٰن وشہود الزور، واہل العماء عن الصواب فی الامور، ہم قدریۃ ہذہ الامۃ ومجوسہا، ان اللہ تعالےٰ

امر تخییراً انہی تحذیراً ولم یکلف بجبر ولا بعث الانبیاء عبثاً ذالک ظن الذین کفروا"

(یعنی شاید تو اس کو قضائے یقینی وقطعی خیال کرتا ہے حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو عذاب و ثواب سب باطل ہوجاتے اور نہ خدا کی طرف سے گنہگار پر ملامت ہوتی اور نہ نیکو کار پر انعام۔ یہ قول ہے شیطان کے بھائیوں، بت پرستوں۔ خدا کے دشمنوں اور دھوکہ بازوں کا۔ خدا نے مجبور بنا کر مکلف نہیں کیا اور پیغمبروں کو بیکار نہیں بھیجا۔ یہ گمان ہے ان کا جو کافر ہیں ؎)

ایک مرتبہ حجاج نے امام حسن بصری سے اسی مسئلہ کو دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا۔

"خدا جس کام سے باز رکھنا چاہتا ہے وہ اس کی طرف سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا خود فرماتا ہے کہ:۔

" لا یرضی لعبادہ الکفر"

(اللہ اپنے بندوں کے کفر پر راضی نہیں)

پس اگر کفر قضا و قدر ہوتا تو خدا یہ نہ فرماتا۔ جہلا کہتے ہیں کہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نیک راہ دکھاتا ہے۔ لیکن اگر وہ آیت کے ماقبل و مابعد پر غور کریں تو معلوم ہوسکتا ہے کہ خدا گناہ کرنے سے پہلے گمراہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کا قول ہے کہ " لفیل اللہ الظالمین" (اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے یعنی ان کی گمراہی کا حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے:۔

فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم و مایضل بہ الا الفاسقین (جب وہ کجی اختیار کرتے ہیں۔ اللہ ان کے دلوں کو کج کردیتا ہے۔ اور وہ گمراہ کرتا ہے مگر فاسقوں کو۔)

حضرت امام حسن نے جب اہل بصرہ کو خط لکھا تو اس میں صاف صاف تحریر کر دیا کہ۔

من حمل ذنبہ علی ربہ فقد فجر۔ ان اللہ لایطاع استکراھاً ولا یعصی بغلبۃ لانہ الملیک لما ملکھم والقادر علی ما اقدرھم علیہ فان عملو بالطاعۃ لم یحل بینھم وبین مافعلوا وان عملوا بالمعصیۃ فلیس ھوالذی اجبرھم علی ذالک فلو اجبراللہ الخلق علی الطاعات لاسقط عنھم الثواب ولو اجبرھم علی المعاصی الاسقط عنھم العقاب ولو اھملھم لکان عجزاً فی القدرۃ ولکن لھم فیھم المشیۃ اللتی عیبھا عنھم فان عملوا بالطاعات کانت لھم المنۃ علیھم وان عملوا بالمعصیۃ کانت لہ الحجۃ علیھم۔

(یعنی جو اپنے گناہ کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے وہ فاجر ہے۔ خدا نہ اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے اور نہ نافرمانی سے کوئی شخص اس پر غلبہ حاصل کرسکتا ہے۔ اگر خدا کی عبادت کریں تو خدا ان کے اور ان کے عمل کے درمیان حائل نہیں ہوتا۔ اگر گناہ کریں تو خدا نے گناہ پر انھیں مجبور نہیں کیا۔ اگر خدا دنیا کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا تو ثواب اٹھا لیتا اور اگر گناہوں پر مجبور کرتا تو عذاب اٹھا لیتا پس اگر وہ اطاعت کریں گے تو خدا کا احسان ان پر ہوگا اور اگر گناہ کریں گے تو ان پر خدا کی حجت ہوگی"

اس قدر بیان سے غالباً یہ امر آپ پر واضح ہوگیا ہوگا کہ اصل مفہوم قضا و قدر کا کیا ہے اور اسلام میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں۔ آج کل عام طور پر جو عقیدہ مجبوری کا پایا جاتا ہے وہ حد درجہ مخرب امن و انتظام ہے اور وہی لوگ اس کے

؎ ملاحظہ ہو ملل ونحل۔

قائل ہیں جو دنیا میں صرف کاہلی اور مکر و فریب کے سہارے سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ انسان نظام تمدن کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہے اور اسے عقل و حواس اسی لئے عطا ہوئے ہیں کہ وہ سوچ سمجھ کر کام کرے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سارا نظام درہم برہم ہو جاتا اور تعلیمات مذہب کا بھی کوئی اثر نہ ہوتا۔ خیر و شر کو اس کی طرف منسوب کرنا صرف اس بنا پر ہے کہ حقیقی فاعل ارادہ و قوت کا وہی ہے اور اس کی عظمت کا خیال جس وقت دل میں جاگزیں ہوتا ہے تو ہم یہی کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ :-
"یفعل ما یشاء" لیکن اس سے یہ معنی تو نہیں کہ اس نے ہمیں بالکل مجبور کر دیا ہے اور ہم کو نیک و بد کی تمیز نہیں دی گئی۔



# ہماری مطبوعات

| | | | |
|---|---|---|---|
| فصیل شب | (ڈرامے) | میرزا ادیب | قیمت ۴ روپے .. |
| چائے والا | (ناول) | اے حمید | قیمت ۴ روپے |
| لال چادر | (ناول) | سید ولی اللہ | " ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| بہو بیگم | (ناول) | پرنسپل ابراہیم خاں | زیر طبع |
| ہفت کشور | (شاعری) | جعفر طاہر | " ۷ روپے |
| صدا بصحرا | (شاعری) | یوسف ظفر | " ۴ روپے ۵۰ پیسے |
| جاگتے جزیرے | (شاعری) | احسن احمد اشک | " ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| سہ آتشہ | (شاعری) | میراجی | زیر طبع |
| راشد کی نظمیں | (شاعری) | ن۔م۔ راشد | " |
| تھکے ہارے | (افسانے) | خدیجہ مستور | " ۵ روپے ۵۰ پیسے |
| تیسری منزل | (افسانے) | ہاجرہ مسرور | " ۵ روپے ۵۰ پیسے |
| سورج بھی تماشائی | (افسانے) | انور | " ۵ روپے ۵۰ پیسے |
| اردو میں سوانح نگاری | (تنقید) | ڈاکٹر سید شاہ علی | " ۷ روپے .. |
| ہاڑے | (پنجابی شاعری) | سائیں فیروز | " ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| پونر پری آکاس | (سندھی شاعری) | شیخ ایاز | " ۸ روپے ۲۵ پیسے |
| پنجابی لوک کہانیاں | | شفیع عقیل | " ۴ روپے ۵۰ پیسے |

## گلڈ اشاعت گھر

اسٹریچن روڈ، کراچی۔ ۴

# منظومات

## (حضرت دل شاہجہانپوری مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام)

تری طلب کے سوا آرزو کوئی نہ رہی
بڑھے کچھ اور تو اپنی بھی آگہی نہ رہی

جو وقفِ ساغرِ صہبائے بیخودی نہ رہی
وہ زندگی کوئی پر کیف زندگی نہ رہی

خموش اِدھر ہوئی اک منتظر کی شمعِ حیات
اُدھر سحر کے ستارے میں روشنی نہ رہی

نمودِ صبحِ قیامت ہے جس کی ہر ساعت
نگاہِ یاس میں وہ شام شام ہی نہ رہی

پھر ایک گردشِ ساغر بہ یادِ عہدِ شباب
کچھ اعتبار نہیں۔ زندگی رہی نہ رہی

وہ مسکراتے ہوئے اس ادا سے گزرے ہیں
چمن میں غیر شگفتہ کوئی کلی نہ رہی

رہا شعورِ نظر بیخودی کے عالم تک
حدودِ ہوش میں پہنچے تو آگہی نہ رہی

وہیں یہ ختم ہوئی داستانِ عشق و وفا
جہاں سے عشقِ ستم میں کوئی کمی نہ رہی

وہی ہیں گل، وہی غنچے وہی نسیم بہار
مگر ادائے تبسم میں دلکشی نہ رہی

غریقِ بحر ہی رہنا کمالِ عرفاں تھا
اُبھر کے پھر ہمیں ساحل سے آگہی نہ رہی

یہ زندگی ہے محبت میں زندگی اے دل
وفائے عشق کو پروائے زندگی نہ رہی

---

محبت رائگاں کیوں ہو محبت بے اثر کیوں ہو
جو تیرے دل میں گھر کر لے وہ رسوائے نظر کیوں ہو

ازل سے ہے جنوں آشفتگانِ عشق کی فطرت
ہمیں پھر انتظارِ موسمِ دیوانہ گر کیوں ہو

چلے میرے ہی دل پر اے قدر انداز یہ ناوک
نصیبِ دشمناں تیری نگاہِ عشوہ گر کیوں ہو

ازل ہی سے مقید ہو چکی ہے روحِ آزادی
قفس کی زندگی میں آرزوئے بال و پر کیوں ہو

پرستشِ آستانِ دوست کی ایمان سمجھتا ہوں / مرے جوشِ عمل پر پندِ ناصح کا اثر کیوں ہو
مثالِ شمع بزمِ دہر میں جلنا گوارا ہے / خموشی جس کی فطرت میں ہے شاملِ نوحہ گر کیوں ہو
وہی دل میں وہی پیشِ نگاہِ شوق رہتے ہیں / مرے ذوقِ تصور کو تلاشِ بام و در کیوں ہو
نیازِ شوق مسلک ہی سہی اہلِ محبت کا / جو دل نظروں میں رہتا ہے وہ خاکِ رہ گزر کیوں ہو
محبت میں اگر ہر آرزوئے دل ہو بیگانہ / کسی کو انتظارِ وعدہ شام و سحر کیوں ہو
ہزاروں حسرتیں نشتر بہ دل۔ دل محوِ خاموشی / کوئی اس سرگزشتِ زندگی سے باخبر کیوں ہو
پرستارِ محبت میں ہوں تو منکر ہے اے ناصح / تری اس ذہنیت کا میری فطرت پر اثر کیوں ہو
تقاضا رو وفا ضبط و تحمل گریہ لاحاصل / جو آنسو وجہِ رسوائی ہوں دامن ان سے تر کیوں ہو
جو اے دل پرسشِ محشر سے پہلے ختم ہو جائے / کسی کی سرگزشتِ عشق اتنی مختصر کیوں ہو

---

اب تو اس مرحلہ کا ہے آغاز / نہ رہا اعتبارِ محرمِ راز
روح پُر کیف ہو نظر کی طرح / مطربِ مستِ ناز چھیڑ وہ ساز
صبحِ پیری ہے رنگِ بزم کو دیکھ / ختم کر داستانِ سوز و گداز
عشق کی آرزو ہے بے انجام / حسن کا ہر کرشمہ بے آغاز
گونجتی ہے ابھی صدائے الست / سن رہا ہوں فضا میں وہ آواز
نہ رہا فرق عابد و معبود / عشق کی بندگی بھی ہے اک راز
ان حدوں سے گذر چکا ہے دل / اب نہیں شکوہ نشیب و فراز
گم ہوں اس بیخودی کی منزل میں / راز ہی کوئی اور نہ محرمِ راز
سرگزشت اس نظر کی کیا کہیے / جس نظر سے ہے عشق کا آغاز
فطرتِ عشق پر نظر اے دل / شمع کی زندگی ہے سوز و گداز
کاوشِ دردِ عشق راحتِ دل / فکرِ درماں عذابِ روح گداز
وہ ہم آغوش ہیں تصور میں / اے شبِ ہجر تری عمر دراز

قطعہ

دل شکستہ تباہ حال ہوں میں / آپ ہیں خواجہ غریب نواز
ہر قدم پر مرے لئے افتاد / آپ آگاہ ہر نشیب و فراز

## (سیّد شفقت کاظمی)

کبھی ز راہِ محبت اسے بھی پوچھا ہے
وہ بے نوا جو ترے آسرے پہ جیتا ہے

سُنا چکا ہے زمانہ ہزار بار مگر
مرا فسانہ ابھی تک نیا نیا سا ہے

ہم اہلِ درد سے رکھی ہے جو روا تو نے
وہ دوستی بھی تری دشمنی کا پردا ہے

سمٹ چلے ہیں جدائی کے فاصلے شاید
مرے قریب سے ہو کر وہ آج گذرا ہے

دل و نظر کو مناسب ہے فرشِ راہ کروں
ابھی ابھی تیری آمد کا خواب دیکھا ہے

کچھ اور بھی ہیں مری زندگی کی تصویریں
میں وہ نہیں جو مجھے دوستوں نے سمجھا ہے

غمِ حیات سے بھی ہم نبھائے جاتے ہیں
ترے خیال کا دامن بھی تھام رکھا ہے

نئی بہار کا مژدہ بجا سہی لیکن
ابھی تو اگلی بہاروں کا زخم تازا ہے

مری حیات ہے مجھ سے جو سرگراں شفقت
مری حیات میں یہ کون کارفرما ہے

---

## (اکرم دھولیوی)

اظہار دردمندیِ الفت نہ کر سکے
کھل کر کبھی ہم ان سے شکایت نہ کر سکے

وہ جوشِ دل ہے کیا وہ جنونِ حیات کیا
دنیائے رنج و غم کو جو غارت نہ کر سکے

کس رنگ سے یہ پھول کھلے اب کے اے بہار
محسوس ہم چمن کی لطافت نہ کر سکے

اکرم بہت قریب تھے محفل میں ان سے ہم
لیکن نظر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے

★

ان کو بھی اے جدائی کیا میری یاد آئی
پہلے سے کیوں زیادہ دل کا سکون کم ہے

اہلِ وفا کی خاطر تکلیفِ دل ہی کیا
خوئے نیازمندی بیگانۂ کرم ہے

راہِ وفا میں تم نے جس دن سے ساتھ چھوڑا
منزل کی سختیوں کا رونا قدم قدم ہے

ڈر ہے کہ درد دل پھر کروٹ نہ کوئی بدلے
پہلے سے آجکل کچھ تکلیف مجھ کو کم ہے
اب جس طرح بھی گزریں لمحات زندگی کے
تنہائیاں ہیں اکرم اور اک سکوت غم ہے

---

(سید حرمت الاکرام)

شکر یہ تیرا بہر حال ہے لازم ورنہ
دل تسلی سے تو اب اور بھی گھبراتا ہے
کہہ دو یہ صبح کے تارے سے کہ ڈوبے نہ ابھی
کوئی بھولا ہوا قصہ مجھے یاد آتا ہے
مصلحت کون اس انداز جنوں کی سمجھے
تیرا دیوانہ تجھے بھول کے اِتراتا ہے
کیسے بتلاؤں کہ ویرانۂ دل میں حرمت
شمع سی کون سر شام جلا جاتا ہے

---

(ضیاء شبنمی)

آج بھی یاد ہیں ماضی کے مہکتے لمحے!
وہ طلسمات میں ڈوبی ہوئی دنیائے شباب
وہ ترے مہندی رچے ہاتھ وہ نازک بانہیں
وہ تبسم کے گلاب اور وہ کلیوں کا حجاب

○

نکھرا نکھرا سا ترا حسن بہاروں کی سحر
مہکا مہکا سا ترا جسم گلابوں کی مہک
زندگی آج بھی ہے محو تماشا اے دوست
کاش مل جائے ترے حسن کی ہلکی سی جھلک

○

چھین کر لے گئی ان جاگتے لمحوں کا سہاگ
وہ بہاروں کے دل آویز اجالوں کی سحر
جس کو بخشی تھی ترے حسن و محبت نے جِلا
کھو گئی غم کے دھندلکوں میں بھٹک کر وہ نظر

○

اس طرح دل سے نکلتی ہے مرے آہ کہ بس
جیسے ترکش سے نکل کر کوئی تیر آتا ہے
کون ہے "وقت" کا صیاد نہیں کوئی نہیں
یہ وہ طائر ہے جو اڑتا ہی چلا جاتا ہے

○

# بیاضِ نیاز

## (انتخاب وحید الہ آبادی)

(وحید الدین احمد متخلص بہ وحید ابن مولوی امیر الدین عرف مولوی امر اللہ متوطن قصبہ کڑہ ضلع الہ آباد)

(سال پیدائش ۱۸۲۹ء سن وفات ۱۸۹۲ء)

واشد دل نہ ہوئی غنچہ خاطر نہ کھلا! کون سے باغ میں آئے تھے ہوا کھانے کو

میں نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اداس کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

اب کہوں حالِ گریہ وزاری ہنس چکے آپ مسکرا بھی چکے

نہ دیا بزم میں ساقی نے جو ساغر نہ دیا خیر صحبت تو میسر ہوئی مے خواروں کی

ہوائے چمن یا نہ آئے قفس تک جو آتی ہے تو بال و پر لے کر آئے

آ گئے آپ! میں کہتا تھا کوئی آتا ہے آج کچھ دل کو مرے صبح سے بے تابی تھی

نہ تھے جب اس قدر بے خود تو کیا کچھ کہتے سنتے تھے

اب اشک آنکھوں میں بھر لانا نہ کچھ کہنا نہ کچھ سُننا

اپنے ہی دم سے ہے بہار و خزاں جب نہیں ہم تو باغ و صحرا کیا

عجب بہار کا عالم نظر سے گزرا ہے ہمیشہ تازہ رہے بوستان خیالوں کا

میں جس کی یاد میں جاتا ہوں جان سے اپنی کبھی خیال بھی اُس کا ادھر نہیں آتا!

تا زیست جسے کہتے تھے سب عیب محبت ہم بے ہنروں کا تھا تو وہی ایک ہنر تھا

آج تک عالم یہ ہے بے تاب ہو جاتا ہے دل کیا کہوں مذکور ہوتا ہے جہاں اک شخص کا

تک رہے ہیں کس نگاہِ یاس سے ہر سمت ہم ہو گئی کیا حالتِ دل آپ کے جانے کے بعد

# مطبوعات موصولہ

## تاریخ صحافت اردو (حصہ دوم)

از امداد صابری

۱۸۵۸ء تا ۱۸۷۵ء کے درمیانی عہد کی صحافتی تاریخ ہے۔ جس میں اس زمانے کے اردو روز ناموں، ہفتہ وار اخباروں، پندرہ روزہ رسالوں اور ماہناموں کا تحقیقی و تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ سرسری نہیں بلکہ ہر طرح جامع ہے اور مولف کی تحقیقی لگن، تدوینی صلاحیت اور تنقیدی شعور کا سراغ دیتا ہے۔

کتاب کا دائرہ کسی پرچے کی تاریخ اجرا، اس کی نوعیت۔ پالیسی اور میعاد و جائے اشاعت تک کی اطلاعات تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں مختلف پرچوں کے مدیروں ناشروں اور اہم مضمون نگاروں کے حالات زندگی بھی محنت و تحقیق سے جمع کر دے گئے ہیں۔ ایسے مضامین و مباحث کے چیدہ چیدہ واقعات و اقتباسات بھی اس میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں جو اب سے پورے سو سال پہلے کی صحافت کا اہم موضوع اور قارئین کی دلچسپی کا مرکز بن گئے تھے۔ اسی کے ساتھ بعض مشاہیر کے سلسلے میں کچھ ایسے اشعار، تاریخی قطعات، تاریخ ہائے وفات و پیدائش تصاویر اور سوانحی واقعات اس کتاب میں مل جاتے ہیں۔ جو تحقیقی کاموں کے لئے نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

گویا اخبار و رسائل یا صحافت کے نام پر اس کتاب میں برصغیر کی زندگی کے بعض ایسے امور و مسائل پر بیش بہا مواد جمع ہو گیا ہے جو نہ صرف صحافت، بلکہ تاریخ و ادب اور ثقافت و سوانح پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بھی بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

کتاب ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور دس روپیہ پچاس پیسے میں شمع بک ڈپو دہلی اور اختر اکاڈمی راولپنڈی سے مل سکتی ہے

## سیر افلاک

از حکیم احمد

ناشر: انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ۔ قیمت:۔ پانچ روپے۔

حکیم احمد اردو کے ان خاموش اور سنجیدہ لکھنے والوں میں ہیں جو وسعت علم کے ساتھ "ہمتِ دشوار پسند" بھی رکھتے ہیں اور مشکل سے مشکل کام آسان بنا لیتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "سیر افلاک" جس میں "ثوابت و سیار" اور شہاب ثاقب و عالم کہکشاں کے ساتھ "نظام کائنات" اور "فضائی سفر" کے دقیق مسائل و مباحث پر عالمانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی ان صفات پر خصوصیت سے دلالت کرتی ہے۔

انجمن ترقی اُردو ہند نے اپنے پنج سالہ پروگرام کے تحت علمی و فنی موضوعات پر کتابیں لکھوانے اور شائع کرانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک اہم اور مفید کڑی ہے۔ اسمیں "نظام فلکی" کے ادق موضوع کو جس دلنشین

…چسپ اور محققانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ یہی نہیں کہ زبان و موضوع پر مصنف کی قدرت و دسترس …بت کرتی ہے بلکہ علمی موضوع پر لکھنے والے اس کتاب کے "اسلوب سادہ" سے اگر چاہیں تو رہنمائی بھی حاصل کر سکتے …ں۔ مصنف کا یہ دعوے "کہ اس کتاب میں اس بات کو مد نظر رکھا گیا ہے کہ مطالب کو سادہ زبان میں بیان کیا جائے …کہ عام طور پر مضمون آسانی سے سمجھ میں آسکے" یونہی نہیں ہے۔ اسے مصنف نے شروع سے آخر تک نبھایا ہے۔

## طلوعِ فردا

از جمیل ملک

طلوع فردا جمیل ملک کا مجموعہ کلام ہے جسے "گوشہ ادب" انار کلی لاہور نے بڑے سلیقہ سے شائع کیا ہے۔

جمیل ملک کی شعر گوئی کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے۔ آپ نے چند سال پہلے ان کا نام سننے میں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ …اعر کی حیثیت سے اس درجہ سامنے آگئے کہ تقسیم کے بعد کی جدید اردو شاعری کا کوئی جائزہ اُن کے ذکر کے بغیر مکمل نہ ہوگا۔

طلوع فردا میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی اور یہ دونوں فکر و جذبہ کے مشترک رشتہ میں گندھی ہوئی ہیں انکی نظموں میں اکثر غزل کا لہجہ …ور ان کی غزلوں میں عموماً نظم کا آہنگ ملتا ہے۔

ہر چند کہ جمیل ملک عصری میلانات پر نظر رکھتے ہیں، وقت کے اہم تقاضوں سے بھی وہ بے خبر نہیں ہیں لیکن جب تک …خبر "یقین" میں اور "نظر" "دل" میں تبدیل نہ ہو جائے وہ محض خارجی حقائق کو شعر کا موضوع بنانا پسند نہیں کرتے یہی …سبب ہے کہ دوسروں کی طرح ان کی شاعری میں جدید و قدیم یا غم جاناں و غم روزگار کے الگ الگ خانے نظر نہیں آتے …ان کی شاعری زندگی کی طرح ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ ایسی اکائی جو صد رنگ بھی اور یک رنگ بھی۔

طباعت و کتابت بھی اچھی ہے۔ کتاب چار روپیہ میں گوشہ ادب لاہور سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

## رنگ و نور

خرد غوث پوری کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ہر چند کہ غزل کے میدان میں کوئی نمایاں جگہ بنا لینا اور چونکا دینے والے اشعار نکال لینا اب آسان نہیں رہا۔ پھر بھی ایک شاعرِ فطرت جس کی گرہ میں کچھ ہوتا ہے وہ اس …کے اظہار کی دل نشیں صورت پیدا کر لیتا ہے۔ خرد غوث پوری کچھ اسی قسم کے نوجوان غزل گو ہیں۔ انھیں نئی بات کو پرانے …ڈھب اور پرانی باتوں کو نئے ڈھب سے۔

مری حق پسندی مری حق نوائی　　مجھے تختۂ دار تک کھینچ لائی
کوئی کتنی ہی زلفیں سنوارے　　وقت کی برہمی کم نہ ہوگی
صبح کا ذکر کرنے سے ہمدم　　شام کی تیرگی کم نہ ہوگی
سوچتا ہوں کبھی ایسا ہوگا　　ان کو احساس تمنا ہوگا
ہوا پائمال وہ گل جو نکل گیا چمن سے
اسے لوٹ لے گی غربت جو نہ رہ سکا وطن میں

اشعار خرد کے روشن مستقبل کا سراغ دیتے ہیں۔

کتاب دو روپے پچاس پیسے میں مکتبہ گلستان ادب کاشی پور روڈ کلکتہ ۲ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

## صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات

## ۱۸۴۸ ـــــ ۱۸۵۳

از محمد عتیق صدیقی
ناشر :- انجمن ترقی اردو ہند علیگڑھ
قیمت :- نو روپے ۔

محمد عتیق صدیقی کی " نظر تحقیق " اب کسی تعارف و تبصرہ کی محتاج نہیں رہی ۔ وہ صحافت و ادب کے تحقیقی شعبے میں اپنی مستقل جگہ بنا چکے ہیں ۔ ان کے تحقیقی کاموں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک بے کیف خارجی حقیقت کو محض سامنے لا کر نہیں چھوڑ دیتے بلکہ اس میں تحقیق اور تنقید کے ذریعہ تخلیق کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں ایسا رنگ جو کسی تحریر کو صحافت کے دائرے سے نکال کر ادب کے حدود میں لے آتی ہے ۔

" صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات " بھی اسی نوع کی ایک نہایت مفید اور دلچسپ چیز ہے ۔ یہ دراصل ترجمہ ہے ۔ اردو اخبارات کی ان رپورٹوں کا جو صوبہ شمالی و مغربی کے گورنر کے حکم سے سال بہ سال تیار کی جاتی تھیں ـــــ یہ رپورٹیں جنھیں مؤلف نے بڑی جستجو کے بعد اردو میں منتقل کیا ہے ، صرف یہی نہیں کہ اسوقت کے صحافی مزاج و رفتار کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں بلکہ ان کے ذریعہ ہماری رسائی سیاست و ادب کے ان میلانات و رجحانات تک ہوتی ہے جو اپنے اصل روپ میں کسی اور جگہ نظر نہیں آتے ۔

فاضل مصنف نے رپورٹوں کے شگفتہ ترجمہ و تلخیص کے ساتھ ایک جامع پیش لفظ بھی اس کتاب میں شامل کر دیا ہے اور اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام کس درجہ افادی اور کس درجہ مشکل تھا جس سے مصنف اپنی ، کہنہ مشقی اور تحقیقی لگن کی بدولت کامیاب و آساں گزر گیا ہے ۔

## کلک موج
## ورق ناخواندہ
## سلومی

از عبدالعزیز خالد

عبدالعزیز کے شعری کے مجموعے ہیں جنھیں خاص اہتمام سے عمدہ کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا گیا ہے ۔

" کلک موج " غزلوں کا مجموعہ ہے ۔ " ورقِ ناخواندہ " پانچ تمثیلوں پر مشتمل ہے ۔ " سلومی " منظوم ڈرامہ ہے ۔ یہ تینوں مجموعے علم و فضل سے گراں بار ہیں اور شاعرانہ صلاحیت سے کہیں زیادہ شاعر کی وسعت مطالعہ کا پتہ دیتے ہیں ۔ ان شعری مجموعوں پر نظر ڈالتے ہی ہمارے ذہن میں انشاءاللہ خاں ابھر آتے ہیں ۔ عبدالعزیز خالد کے یہاں انشاءاللہ خاں کا پھکڑ پن تو خیر کہیں نہیں ہے اور یہ ہونا بھی نہ چاہیے تھا ۔ اس لئے کہ یہاں کبھی نواب کی صحبت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن مختلف زبانوں سے ان کی آگہی و تبحر علمی اور شاعروں میں اسکے نمود کی کوشش ۔ انھیں انشاءاللہ خاں سے بہت قریب لے آتی ہے ۔ اور اسی لئے یہ خطرہ بہرحال باقی رہتا ہے کہ ان کا علم و فضل کہیں ان کی شاعری کو نہ لے ڈوبے ۔

شاعری میں علم و فن کا اظہار کوئی عیب نہیں ہے ۔ علم و فن سے گہری واقفیت ہی سے کلام میں عظمت ۔ افادیت اور ابدیت کے آثار پیدا ہوتے ہیں ۔ لیکن شاعری میں فضل و کمال کو اس طور پر برتنا چاہیئے کہ جس طرح کہ درد ۔ میر ۔ مصحفی آتش ۔ میر حسن ۔ غالب ۔ مومن ۔ نواب مرزا شوق ۔ اور فیض وغیرہ نے برتا ہے نہ کہ اس طرح جس کی مثالیں ۔ سودا انشا ۔ ناسخ ۔ شاہ نصیر ۔ ذوق ۔ دبیر اور امیر کے یہاں ملتی ہیں ۔

بہر حال عبدالعزیز خالد کی شاعری اس لحاظ سے ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے کہ ہماری شاعری کو تخیل جذبہ اور احساس کے مخصوص دائروں سے نکال کر علم وفکر کی وسعتوں میں لے جانا ہی چاہتی ہے دیکھنا یہ ہے دنیائے شاعری ان وسعتوں سے کیا کھوتی ہے اور کیا پاتی ہے۔

تینوں کتابیں چودہ روپیہ میں بک لینڈ بندر روڈ کراچی ۱؎ اور دوآبہ کواپریٹو پبلشیر کراچی سے مل سکتی ہیں۔

## روپ نگر

منظور ممتاز کے اس ناول میں زندگی کی بڑی تلخ لیکن سچی حقیقتوں کو ناول کے پیرائے میں بے نقاب کیا گیا ہے۔ ناول کا ہیرو، ایک پروفیسر اپنی جنم بھوم روپ نگر کو چاند نگر بنا دینے کی فکر میں علم وفن اور مادی ترقی کی ہر منزل طے کرتا ہے لیکن افسوس کہ وہ اس روحانی مسرت سے محروم رہتا ہے جو ایک فرماں بردار بیٹا، ایک شفیق باپ۔ ایک اچھا شوہر اور خاندان کا ایک ہونہار فرد بننے کے بعد ایک آدمی محسوس کرتا ہے۔ زن و مزاجوں کی عدم مطابقت، خیالات کی دقیانوسیت، سماج کے غیر ضروری بندھن۔ والدین کا لاڈ پیار، جنسی لگاؤ کی بے اعتدالیاں۔ معاشی عدم مساوات اور عملی دنیا سے گریز کر کے نظری دنیا میں پناہ لینے کی کوشش انسان اور اس کے معاشرے سے زندگی کی خوشیوں کو کس طرح چھین لیتی ہے۔ اس کا اصل اندازہ اس ناول کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

۶۰۰ صفحات کا یہ ناول، بہ لحاظ فن اور زبان و بیان ایسے محاسن کا حامل ہے کہ ہم اسے ایک معیاری ناول کہہ سکتے ہیں۔

ناول آٹھ روپے میں ممتاز پبلیکشنز، لاہور سے مل سکتا ہے۔

## صبح بنارس

مرتبہ:۔ عشرت کرت پوری

قیمت:۔ دو روپیہ پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:۔ جاوید پبلشرز۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی ۶

شیخ علی حزیں نے جس بنارس کے متعلق کہا تھا کہ:۔

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است ایں جا

اسی کے متعلق عشرت کرتپوری نے مشاہیر سخن کی نظمیں جمع کی ہیں اور بڑے سلیقہ سے ترتیب دے کر منظر عام پر لائے ہیں۔ "پہلی کرن" کے عنوان سے مرتب نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ اس کتاب کی افادیت کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔

اس میں بنارس کے تاریخی و تہذیبی پس منظر کو جس اختصار و خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے وہ مرتب کی محنت اور خوش ذوقی اور بنارس کی سرزمین سے شغف کا ثبوت ہے۔

---

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔

علی شیر خاں۔ محلہ کھترانہ کلاں رائے بریلی۔ یو۔ پی

# تصانیف مولانا نیاز فتح پوری

**انتقادیات** مولانا نیاز فتحپوری کے معرکۃ الآرا ادبی ـ تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی ـ ہر مقالہ اپنی جگہ حرف آخر اور معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے ـ اردو زبان اردو شاعری غزل گوئی کی رفتار ترقی اور ہر بڑے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے ـ یہ کتاب اسی اہمیت کی بنا پر پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہے ـ
قیمت :- چار روپے ۵۰ پیسے

**مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ** مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں مذاہب عالم کی ابتداء، مذہب کا فلسفہ وارتقاء مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسیحیت کو علم وتاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے ـ
قیمت : ایک روپیہ ۷۵ پیسے

**مشکلاتِ غالب** غالب کے تمام مشکل اشعار اردو کا نہایت صاف وصحیح حل جو وضاحت بیان کے لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے ـ
قیمت :- دو روپے

**عرضِ نغمہ** ٹیگور کی گیتانجلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جو نایاب ہو گیا تھا وہ اب دوبارہ طبع ہوا ہے ـ معہ ایک بسیط مقدمہ کے ـ
قیمت :- ایک روپیہ

**ترغیباتِ جنسی** مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں فحاشی کی تمام فطری وغیر فطری قسموں کے حالات، ان کی تاریخ ونفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی ـ
قیمت :- پانچ روپے ۵۰ پیسے

**تاریخ کے گمشدہ اوراق** حضرت نیاز کے چوبیس افسانوں کا مجموعہ جو تاریخ اور انشائے لطیف کے امتزاج کا بلند ترین معیار قائم کرتے ہیں، ان افسانوں کے مطالعے سے واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے ـ
قیمت :- دو روپے

**جذبات بھاشا** مولانا نیاز فتحپوری نے ایک دلچسپ ادبی عالمانہ تمہید کے ساتھ ہندی شاعری کے بہترین نمونے پیش کر کے انکی تشریح ایسے تخلیقی انداز میں کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی اور جس میں ہندی کلام کے بیش بہا نمونے نظر آتے ہیں ـ قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے

**ایک شاعر کا انجام** حضرت نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا طویل افسانہ جس سے افسانہ نویسی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اس کا ایک ایک جملہ حسن وعشق کی تمام نشہ بخش کیفیات سے معمور ہے یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ اسکی نظیر نہیں ملتی ـ قیمت :- ایک روپیہ

**نقاب اُٹھ جانے کے بعد** حضرت نیاز کے تین افسانوں کا مجموعہ ـ بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت اور علماء کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا ہماری معاشرت واجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ثابت ہو رہا ہے ـ زبان، پلاٹ، اور انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ـ

**شبنمستان کا قطرہ گوہرین** مولانا نیاز فتحپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی کے بہترین شاہکار پیش کئے گئے ہیں ـ ہر افسانہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے ـ قیمت :- ایک روپیہ ۲۵ پیسے

**منیجر نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳**